دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

جولائی تا ستمبر 2019ء ذوقعدہ تا محرم الحرام 1440-41ء جلد نمبر 11 شمارہ نمبر 3 رجسٹرڈ نمبر 370-S

www.rahimia.org

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک مکمل نظام ہے

''فرزندانِ توحید! آج تمھارے ایمان و اخلاص کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ خدا تعالیٰ دیکھ رہا ہے کہ کون اس کے جلال و جبروت کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ اور کون ہے، جو دنیا کی ناپائیدار ہستیوں کے خوف سے خدا کی امانت میں خیانت کرتا ہے۔

اگر تم کو میدانِ محشر میں خدا کے سامنے پیش ہونا ہے، اگر تم کو رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی آرزو ہے تو اُس کے پاک دین کی حفاظت کرو۔ اس کے مقدس احکامات کی اطاعت کرو۔ اس کی امانتِ توحید کو برباد نہ ہونے دو اور اُس کی دی ہوئی عزت کو حقیقی عزت سمجھو۔

اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ تمام مذہبی، تمدنی، اَخلاقی، سیاسی ضرورتوں کے متعلق ایک کامل اور مکمل نظام رکھتا ہے۔ جو لوگ کہ زمانۂ موجودہ کی کشمکش میں حصہ لینے سے کنارہ کشی کرتے ہیں اور صرف حجروں میں بیٹھے رہنے کو اسلامی فرائض کی ادائیگی کے لیے کافی سمجھتے ہیں، وہ اسلام کے پاک و صاف دامن پر ایک بدنما دھبہ لگاتے ہیں۔ ان کے فرائض صرف نماز، روزہ میں منحصر نہیں، بلکہ ان کے ساتھ ہی اسلام کی عزت برقرار رکھنے اور اسلامی شوکت کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوتی ہے۔

وفّقنا اللّٰہ و إیّاکم لِما یُحبُّ و یرضیٰ.

(اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں اپنے محبت و رضامندی کے کاموں کی توفیق عطا فرمائے۔)''

(قومی اجتماعیت کے تقاضے اور علما کی ذمہ داریاں، ص: 65)

دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی، تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

جولائی تا ستمبر 2019ء / ذوالقعدہ تا محرم الحرام 41-1440ھ | جلد نمبر 11 شمارہ نمبر 3 | رجسٹرڈ نمبر 370-S

بانی حضرت اقدس مولانا **شاہ سعید احمد** رائے پوری قدس سرہٗ السعید

مجلس ادارت

مدیرِ اعلیٰ	سرپرست
حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری	پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن
مدیر	**صدر**
مولانا محمد عباس شاد	مفتی عبدالمتین نعمانی

مجلس مشاورت

☆ مفتی محمد اشرف عاطف	لاہور	☆ ڈاکٹر سید لیاقت علی شاہ معصومی	سکھر	☆ پروفیسر ڈاکٹر تاج افسر	اسلام آباد
☆ مفتی عبدالقدیر	چشتیاں	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد ناصر	جھنگ	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد سعید اختر	اسلام آباد
☆ مفتی محمد مختار حسن	نوشہرہ	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل	سعودی عرب	☆ پروفیسر قاضی محمد یوسف	حسن ابدال
☆ مولانا عبداللہ عابد سندھی	شکارپور	☆ پروفیسر ڈاکٹر ابرار محی الدین	بہاولپور	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر	لاہور

قیمت فی شمارہ : -/200 روپے

سالانہ زرِتعاون -/800 روپے

شعبۂ مطبوعات

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ رجسٹرڈ) لاہور

رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

Ph: 0092-42-36307714 , 36369089 - Web: www.rahimia.org

مدیرِ اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع و ناشر نے اے جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر سہ ماہی مجلّہ ''شعور و آگہی''، رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ لاہور سے شائع کیا۔

www.rahimia.org

فہرست مقالات

اداریہ

حرفِ اوّل — مدیرِ اعلیٰ — 3

ولی اللّٰہی افکار؛ عصری اھمیت

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اِرتفاقات (4) — از حضرت مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری ☆ — 5

مطالعہ تحریکاتِ آزادی

قومی اجتماعیت کے تقاضے اور علما کی ذمہ داریاں — ترتیب وتخریج مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری — 45

خطبہ صدارت از حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
صدرِ اوّل جمعیت علمائے ہند

مطالعۂ ردِ نوآبادیات

نوآبادیاتی دور کے ہندوستان میں انگریزی ادب کی تعلیم — تحریر شاہ زیب خان ☆ — 79

ایک ردِّ نوآبادیاتی تجزیہ

مطالعۂ قرآنیات

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی قرآنی خدمات کا جائزہ — تحریر رشید احمد ☆ — 89

بیادِ شیخ

ہمارے رہبر و رہنما اور مربی
حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ — تحریر حافظ نورالدین سومرو ☆ — 109

تعارف مقالہ نگار

☆ مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری — ناظم اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور و مسند نشین سلسلۂ عالیہ رحیمیہ رائے پور

☆ شاہ زیب خان — اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ انگریزی زبان وادب، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

☆ رشید احمد — لیکچرر شعبہ علومِ اسلامیہ، یونی ورسٹی آف ایگری کلچر، ملتان

☆ حافظ نورالدین سومرو — ایم فل سکالر پولیٹیکل سائنس، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو، سندھ

www.rahimia.org

اداریہ

حرفِ اوّل

انسانی زندگی فطری طور پر اجتماعیت پسند رہی ہے۔ انسان ہمیشہ سے مدنی الطبع رہا ہے۔ اُس کی طبیعت میں تمدن، تہذیب اور سوسائٹی کے اجتماعی تقاضے ودیعت کیے گئے ہیں۔ اسی کی تکمیل کے لیے حضرات انبیا علیہم السلام کے علوم میں سے ایک اہم ترین علم ''علم الارتفاقات'' ہے۔ تمام انبیاؑ کو انسانیت سے متعلق اس علم سے حصہ وافر عنایت کیا گیا۔ اس لیے کہ دنیا میں انسانی زندگی کی بقا اور نسلِ انسانی کا فروغ اسی علم کا مرہونِ منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سے قُرب اور تعلق کے علم — علم الاقترابات — کے ساتھ ساتھ اِرتفاقات کا علم بھی انبیاؑ کی تعلیمات کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاؑ پر یہ علم خاص طور پر نازل کیا گیا۔ کتبِ مقدسہ، خاص طور پر قرآن حکیم میں ''علم الارتفاقات'' کی اہمیت کو خوب وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، تاکہ لوگ اجتماعی مفاد کے مطابق ارتفاقات کا بہترین نظام قائم کریں اور باہمی لڑائی جھگڑوں اور انفرادیت پسندی پر مبنی نفرتوں کے دائرے سے باہر نکلیں۔

حضرات انبیا علیہم السلام کی نبوی تعلیمات اور اُن کا تاریخی تسلسل اسی حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے۔ چناں چہ حضرت آدم علیہ السلام کی دنیا میں آمد کے ساتھ ہی انھیں ارتفاقات پر مبنی اجتماعیت کا علم و شعور عطا کیا گیا۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں: ''**أنّہٗ اُفیض علیہ فی وقتٍ من أوقات تجرّد الرّوح من غواشی الطّبیعۃ علم الارتفاقات، و الحاجۃ الّتی تقع لبنی النّوع، و الآلات الّتی یرتفق بھا.**'' (تاویل الاحادیث، ص: 15) (بے شک حضرت آدم علیہ السلام کی روح جب طبیعت کے پردوں سے نکل کر اوپر اٹھی تو اُن پر علم الارتفاقات کا فیضان کیا گیا۔ ان پر انسانی نوع کو درپیش احتیاجات اور انھیں ارتفاقات کے اصول پر سہولتوں کے ساتھ پورا کرنے کے آلات و اوزار اور طریقۂ کار کا فیضان کیا گیا۔)

اسی طرح آدمِ ثانی حضرت نوح علیہ السلام کی پوری جدوجہد کا محور بھی ارتفاقات کے نظام میں فساد برپا کرنے والے افراد کے خلاف جدوجہد سے عبارت ہے۔ اس حوالے سے حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''**و کان قومہٗ فُسّاقاً، أفسدوا الارتفاقات، و انسدّ سبیلھم إلٰی اللّٰہ، و خرجوا عن معنی الإنسانیۃ، و إن کان صورتھم صورۃ الإنسانیۃ.**'' (ایضاً، ص: 18) (حضرت نوح علیہ السلام کی قوم انسانی حقوق کو توڑنے والے فاسق اور اللہ کے احکامات کے منکر ایسے لوگ تھے کہ جنھوں نے ارتفاقات کے نظام میں فساد پیدا کردیا تھا۔ اس طرح اُن کے اللہ کی طرف جانے کا راستہ بند ہوگیا تھا۔ وہ انسانیت کے دائرے سے نکل چکے تھے۔ اگرچہ ان کی شکل و صورت انسانوں کی طرح تھی۔) چناں چہ اسی وجہ سے اُن کی قوم پر عذاب آیا۔ پھر باقی بچ جانے والے لوگوں کو حضرت نوح علیہ السلام نے ''علومُ الارتفاقات'' کے مطابق عمل کرنے کا پابند بنایا۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''**لـمّا نفث فی روعہٖ شیء من الاحتیال لبقاء بنی آدم، التویٰ فیہ شیء من علوم الارتفاقات،**

www.rahimia.org

فوصّٰی بها بنيه'' (ایضاً، ص: 20) (جب حضرت آدمؑ کی اولاد کی بقا کا صحیح طریقۂ کار حضرت نوح علیہ السلام کے دل میں ڈالا گیا تو اُن میں علومُ الارتفاقات بھی شامل تھے۔ چناں چہ انھوں نے اپنی اولاد کو ان علوم کی پابندی کرنے کی وصیت فرمائی۔) ایسے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''و كان إبراهيم عليه السّلام تلقّى من الإنسان الإلٰهى علم الارتفاقات، و علم البرّ و الإثم'' (ایضاً، ص: 29) (حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے امامِ نوعِ انسانی کے ذریعے سے ''علم الارتفاقات'' اور ''علم البرّ و الإثم'' اِلقا کیے۔) دیگر انبیاؑ کا بھی یہی حال شاہ صاحبؒ نے بیان کیا ہے۔

امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تمام اقوامِ عالم کی طرف مبعوث ہوئے۔ اس لیے بین الاقوامی سطح پر ارتفاقات کے علوم غالب کرنے کے لیے ہی آپؐ کو بھیجا گیا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ حضورؐ کے علوم سے متعلق بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ''و منها أنّهٗ رزقهٗ اللّٰه تعالٰى فطنة يعرف بها الارتفاقات من آداب المعيشة، و تدبير المنزل، و المعاملات، و سياسة المدينة، و سياسة الاُمة، فعرف المصالح الّتى يجرى القوم فيها، و عرف الصّحيح من السّقيم، و عرف الّذى يليق بالآراء الكلّية النّازلة من تلقاء الحقّ، و الآراء الجزئية، النّاشئة من هواجس النّفوس، و جور الرّؤساء و الملك و نحو ذٰلك.'' (ایضاً، ص: 79) (حضورِ اقدسؐ کو دیے گئے علوم میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپؐ کو ایک خاص قسم کی ذہانت و فطانت عطا فرمائی تھی، جس کے ذریعے سے آپؐ نے ارتفاقات کے نظام کی صحیح پہچان پیدا کرائی، خواہ اُن کا تعلق معیشت کے امور سے ہو، یا گھریلو اور خاندانی نظام کی بہتری سے ہو۔ انسانوں کے درمیان معاملات ہوں، یا ملکی سیاست اور بین الاقوامی سطح پر اُمتوں کی سیاست سے متعلق امور ہوں۔ آپؐ نے ان تمام انسانی مصالح اور مفادات کا تعارف کرایا، جس پر قوموں کا عمل کرنا ضروری ہے۔ آپؐ نے صحیح اور غلط کے درمیان پہچان پیدا کرائی اور اُن اُمور کی بھی نشان دہی فرمائی، جو حق تبارک و تعالیٰ کی طرف سے مفادِ عامہ اور رائے کلی (اجتماعی مفاد) کے مطابق ہیں۔ اور ''رائے جزئی'' کی بنیاد پر اُن کے انفرادی آرا کی بھی نشان دہی کی، جو خواہشاتِ نفس سے پیدا ہوتی ہیں اور حکمرانوں کے ظلم اور بادشاہوں کی زیادتی وغیرہ کا سبب بنتی ہیں۔) چناں چہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ حضورؐ کی بعثت کا مقصد بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ''فبعث اللّٰه محمّداً رسولهٗ ﷺ فبرز الدّين الحنيفى بروزهٗ علٰى وطيرة الارتفاق الرّابع، فتمّ أمر اللّٰه تعالٰى و وقع ما أراد'' (البدور البازغہ، ص: 253) (پس اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا۔ چناں چہ انھوں نے دینِ حنیفی کو ارتفاقِ رابع کے طور پر دنیا میں غالب کیا۔ اس طرح پر کہ اللہ کا حکم مکمل ہوا اور جو کچھ اس نے چاہا، وہ پورا ہوا۔) انبیا علیہم السلام کے تاریخی تسلسل سے علم الارتفاقات کی اہمیت بہ خوبی واضح ہو جاتی ہے۔

اس شمارے کا پہلا مقالہ ''امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اِرتفاقات'' اسی علم سے متعلق ہے۔

اس شمارے کا دوسرا مقالہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ایک خطبہ صدارت کے تحقیق متن پر مشتمل ہے۔ تیسرا مقالہ ''نوآبادیاتی دور کے ہندوستان میں انگریزی ادب کی تعلیم؛ ایک ردِ نوآبادیاتی تجزیہ'' اور چوتھا مقالہ ''آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر پر فوجی مقدمے کی قانونی حیثیت'' اور آخر میں انگریز سامراج کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف ایک اہم منظوم شامل اشاعت کی جا رہی ہے۔ یہ تمام مقالات علم الارتفاقات سے متصادم نوآبادیاتی دور کے انفرادیت پسندی پر مبنی سامراجی نظام کے خلاف مزاحمتی شعور کی توانا آواز ہیں۔ امید ہے قارئین ان مقالات سے اس خطے کے تاریخی حقائق تک رسائی حاصل کر پائیں گے۔ (مدیرِ اعلیٰ)

www.rahimia.org

ولی اللّٰھی افکار؛ عصری اھمیت

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اِرتفاقات

از حضرت مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

(4)

(پاکستان کی معروف تعلیمی درس گاہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں موسیٰ پاک شہید چیئر شعبہ علومِ اسلامیہ کے زیرِاہتمام ''امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار اور عصرِ حاضر'' کے عنوان پر حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم (ناظم اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ ٹرسٹ لاہور) نے اپریل 2017ء میں درجِ ذیل موضوعات پر چار روز لیکچر دیے:

1۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت اور فکر؛ ایک تعارف　2۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اَسرارِ دین

3۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ معیشت　4۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ ارتفاقات

ان میں پہلا لیکچر 17/اپریل 2017ء بروز سوموار کو ہوا تھا، جسے تحقیق وتخریج کے ساتھ ''شعور وآ گہی'' کے گزشتہ شمارے (4، جلد10) میں شائع کیا جا چکا ہے۔ جب کہ دوسرا اور تیسرا لیکچر بالترتیب 18 اور 19/اپریل 2017ء کو ہوا تھا، جو تحقیق وتخریج کے بعد ''شعور وآ گہی'' کے گزشتہ دو شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ چوتھا لیکچر مؤرخہ 20/اپریل 2017ء بروز جمعرات کو سیمینار ہال، شعبہ علومِ اسلامیہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں ہوا تھا۔ اس سیشن کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد چوہدری (قائم مقام وائس چانسلر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان) نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر محمد ادریس لودھی (ڈائریکٹر سیرت چیئر، شعبہ علوم اسلامیہ، زکریا یونیورسٹی ملتان) نے سرانجام دیے۔ ان مجالس میں شعبہ علومِ اسلامیہ کے اساتذہ، طلبا اور ملتان شہر سے اہلِ علم و دانش اور علما نے بھی شرکت کی۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کی نشست بھی ہوئی۔ اس کے بعد صدرِ مجلس نے صدارتی کلمات ارشاد فرمائے۔

پیشِ نظر مقالہ اسی لیکچر سیریز کے چوتھے خطبے پر مشتمل ہے۔ حضرت رائے پوری مدظلہٗ نے جو خطبہ دینے کے لیے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں سے بہت سے اقتباسات جمع کیے تھے، مقالے کی تخریج وتحقیق کرتے ہوئے انھیں متعلقہ مقامات پر مقالے میں شامل کر دیا گیا ہے، تاکہ شاہ صاحبؒ کی اصل عبارتیں بھی قارئین کے سامنے رہیں۔ اس مقالے پر بھی حضرت رائے پوری نے نظرِ ثانی اور تحقیق وتخریج کی ہے اور اسے تحریری صورت دیتے ہوئے عبارتوں کی نوک پلک درست کی گئی ہے اور حک وترمیم اور اضافہ بھی کیا ہے۔ اس طرح یہ چوتھا لیکچر بھی ایک مکمل مقالے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ مدیر)

www.rahimia.org

تمہیدی کلمات

پرفیسر ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن
مسئول موسیٰ پاک شہید چیئر
شعبہ علومِ اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

نحمدہٗ و نصلّی علٰی رسولہٖ الکریم.

محترم سامعین و سامعات! جس موضوع پر یہ لیکچر سیریز آپ کے سامنے ہو رہی ہے، اس کا جو بنیادی مقصد ہے، اس سے میرا خیال ہے کہ آپ اچھی طرح آگاہ ہو چکے ہوں گے۔ ہمیں اس بات کی بنیادی طور پر فکر کرنی ہے کہ اس وقت مجموعی طور پر دنیا میں مسلمان مغلوبیت سے دوچار ہیں۔ اس مغلوبیت سے نکلنے کے لیے یقیناً جذبات بھی موجود ہیں اور کاوشیں بھی ہیں، لیکن نتائج اس کے مطابق نہیں۔ اصل مقصد ہمیں اس بات کو پانا ہے کہ ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے؟ جذبات ہمارے ہاں بے پناہ ہیں اور بہت سے موقعوں پر اس کا ہم ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ قربانی کا جذبہ بھی ہے، مال خرچ کرنے کا جذبہ بھی ہے، جان دینے کا جذبہ بھی ہے، جان لینے کا جذبہ بھی ہے، لیکن ان تمام کوششوں اور قربانیوں کے باوجود صورتِ حال میں بہتری کے آثار نہیں ہیں۔ ایک زوال ہے کہ مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔

اس کا ہمیں اعتراف کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے ایک مخصوص دائرے میں رہ کر سوچتے رہیں گے تو نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔ جب ایک طرف ہم یہ دعویٰ رکھتے ہیں اور حقیقت بھی ہے کہ دینِ اسلام پوری انسانیت کا دین ہے۔ یہ دین معاشرت کا دین ہے۔ یہ دین سیاست کا دین ہے۔ یہ دین معیشت کا دین ہے۔ اَخلاق کا دین ہے۔ یہ سارے ہمارے اظہارات ہیں کہ ہم ان کا تذکرہ کرتے ہیں، لیکن سوال یہی سامنے آتا ہے کہ ان چیزوں کے حوالے سے ہمارے اندر کتنی سوچ اور کتنی فکر موجود ہے؟ اس کے لیے کیا حکمتِ عملی موجود ہے؟

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا تذکرہ محض ایک خراجِ عقیدت کے طور پر نہیں۔ اُن کا جتنا بڑا کام ہے، وہ یقیناً اس کام کے سبب اللہ کے ہاں سرخرو ہو چکے ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ اُن کی جو محنت ہے، ان کا جو فکر ہے، اور خاص طور پر جو اُن کا منہجِ فکر ہے، ان کے سوچنے کا جو ایک انداز ہے کہ کس طرح چیزوں کو دیکھا جائے۔ کس طرح چیزوں پر غور کیا جائے۔ اس اندازِ فکر کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کچھ باتوں کو یاد کر لیں اور ان کو بغیر سوچے سمجھے دہرانا شروع کر دیں۔ اصل مقصود یہ ہے کہ وہ اندازِ فکر، وہ نظامِ فکر، وہ طریقۂ فکر ہے کیا؟ وہ آج ہمیں کیا سبق دیتا ہے؟ کس طرح آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے؟ انھوں نے جو نظامِ فکر دیا، آج

www.rahimia.org

اُس کے کیا تقاضے بنتے ہیں؟

جب تک ہم دین کو معاشرے کے دین کے طور پر، زندہ دین کے طور پر اور انسانیت کے دین کے طور پر نہیں دیکھیں گے، تو پھر نتیجہ گروہیتوں کا نکلتا ہے، فرقوں کا نکلتا ہے، مسلکوں کا نکلتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ کوئی بھی فرقہ اور مسلک ہو، اس وقت وہ بھی اندرونی طور پر متحد نہیں ہے۔ اُس کے اندر بھی آپ کو بہت ساری دراڑیں نظر آتی ہیں۔ جب ذہنیت ہی جھگڑے کی ہوگی، تنازعے کی ہوگی، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی ہوگی اور اپنے آپ کو حرفِ آخر قرار دینے کی ہوگی تو تقسیم کا عمل کہیں نہیں رُکے گا۔ ہر فرقے کے اندر ذیلی فرقے نظر آئیں گے۔ پھر ان ذیلی فرقوں کے اندر مزید آپ کو تقسیم نظر آئے گی۔ بات یہاں تک آجاتی ہے — جو مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے کہی تھی — کہ ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی ذات کو حق سمجھتا ہے اور اپنے علاوہ سب کو باطل سمجھتا ہے کہ میں جو سوچ رہا ہوں، میں جو کہہ رہا ہوں اور میری جو بات ہے، یہ دین ہے، اور باقی سب مرتد ہیں۔

اس ماحول کے اندر ہمیں اور خاص طور پر جو پڑھے لکھے لوگ ہیں، یونیورسٹی میں جب آپ پہنچتے ہیں تو یونیورسٹی سے بڑھ کر تو اَور کوئی ادارہ نہیں، اور یہاں یونیورسٹی کے فضلا ہوتے ہیں، گریجویٹس ہوتے ہیں، اُن سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ سوسائٹی کی رہنمائی کریں، سوسائٹی کی قیادت کریں اور سوسائٹی کو اس گڑھے سے نکال کر آگے لے کر جائیں۔ وہ mob یا ہجوم کے پیچھے چلنے والے نہیں ہوتے۔ ہمارے ہاں موب چلتا ہے تو پھر لوگ اس کی قیادت سنبھال کر اور اُس ہجوم کو مزید مشتعل کر کے اپنی قیادت منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اصل میں ہمیں اس وقت صاحبِ فکر لوگوں کی ضرورت ہے، جو معاشرے کے مسائل پر حقیقی طور پر غور وفکر کریں۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا سب سے بڑا حصہ (Contribution) یہ ہے کہ وہ ایک صاحبِ فکر شخصیت ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے بہت ساری کتابیں لکھ دیں اور کسی کتاب کا رُخ مشرق اور کسی کا مغرب کی طرف ہو۔ لکھنے والے بہت ہوتے ہیں دنیا میں۔ آپ کو بہت سارے لوگ مل جائیں گے اور کتابیں ان کی بہت سی ہوں گی، لیکن ان کتابوں کا کوئی مرکزی نقطہ نہیں۔ جو کچھ معلومات جمع ہوئیں، وہ کتاب والے نے لکھ دیں۔ کچھ ادھر سے پڑھا، کچھ ادھر سے سنا تو وہ کتاب بن گئی۔ جب کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں کے اندر آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ منطقی ربط نظر آئے گا۔ ایک مربوط فکر ہے۔ اور اسی مربوط فکر کی اور اسی منہج کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

لیکچرز کی اس سیریز کا اصل مقصد یہ تھا کہ جس عظیم شخصیت سے ہم سب واقف ہیں، اُن کا نام ہم سب جانتے ہیں، ہمارے سلیبس میں بھی اُن کا تذکرہ ہے، ہمارے مدارس میں بھی ذکر ہے، ہمارے مدارس کی جو اسناد ہیں، ان کے اندر ذکر ہے، دیوبندی مدارس میں ذکر ہے، بریلوی مدارس میں ذکر ہے، اہل حدیث مدارس میں ذکر ہے، غرض! اُن کا تذکرہ بہت ہے، لیکن وہ شخصیت ہے کیا، اس کی فکر کیا ہے؟ اور اس فکر کی آج کیا اہمیت ہے اور اس کا کیا تقاضا ہے؟ یہ موضوع عام طور پر ہمارے ہاں بحث سے خارج ہے۔ اس وقت برصغیر میں جتنی بھی تحریکات — جو دین کے

www.rahimia.org

نام سے موجود ہیں — سب کی سب اپنی نسبت امام شاہ ولی اللہؒ کی طرف کرتی ہیں۔ اب وہ کتنے فی صد درست ہے، یہ ایک علاحدہ موضوع ہے، لیکن اُن کی شخصیت کا ایک بہت گہرا اثر (impact) موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تأثر محض ایک عقیدت کے طور پر یا ایک ماضی کی کہانی کے طور پر رہے گا؟ یا ایک قوتِ محرکہ کے طور پر؟ اگر ہمارے اندر سوچنے کا، غور و فکر کرنے کا، نتائج تک پہنچنے کا اور اُن نتائج سے معاشرے کو مستفید کرنے کا میکانزم پیدا ہوتا ہے تو پھر تو یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس شخصیت کی فکر سے انصاف کیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت پر ان چار لیکچرز میں پوری طرح بات نہیں ہوسکتی۔ یہ شروعات ہے۔ ایک آغاز ہے۔ یقیناً اس آغاز سے مزید راستے کھلیں گے۔ اس وجہ سے آپ خواتین وحضرات نے تین دنوں سے جس موضوع پر گفتگو سنی اور صاحبِ گفتگو حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد صاحب، واقعتاً اس موضوع پر بڑی گہری دسترس رکھتے ہیں۔ خود آپ کو بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ جو اُن کا مطالعہ ہے۔ اور پھر ان چیزوں کو جو ان کے سمجھنے کا انداز ہے، اور یہ سب چیزیں باقاعدہ انھوں نے حاصل کیں۔ یعنی جیسے اُن کا اپنا مطالعہ ہے، اسی طریق سے اُن کا تعلق رہا ہے حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب سے، جو حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے شاگرد تھے۔ اُن سے امام شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے حوالے سے، اُن کے فکر کے حوالے سے براہِ راست اُن کو تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ اسی طرح اُن کے اپنے شیخ حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کی پوری زندگی اسی فکر کی ترویج میں گزری۔ ان کی معیت، ان کی صحبت سے ظاہر ہے بہت کچھ آج کے دور کے حوالے سے حاصل کیا۔ سب سے اہم چیز یہی ہوتی ہے کہ فکر کی عصری تشکیل، اُس فکر کا عصری اطلاق اور آج کے مسائل پر غور وفکر، اصل چیز یہی ہوتی ہے۔ یہ فکر آج کیا تقاضا کرتی ہے؟

اس دوران پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد چوہدری صاحب قائم مقام وائس چانسلر تشریف لائے ہیں، ہم ان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ڈاکٹر عزیر صاحب شعبہ فارسی کو بھی ہم خوش آمدید کہتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی کہ حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جو شخصیت ہے، یہ محض ایک کتابی شخصیت یا محض ایک صاحبِ مزار شخصیت نہیں ہے، بلکہ صاحبِ فکر شخصیت ہے۔ اس چیز کو عقیدت کے بل بوتے پر منوانا مقصد نہیں ہے کہ ایک بڑے بزرگ تھے، بڑے اچھے آدمی تھے اور بڑا کام تھا، بلکہ شعور کی بنیاد پر، سوچ سمجھ کی بنیاد پر جاننا ہے کہ اُن کی فکر ہے کیا ؟ وہ کیا نظامِ فکر رکھتے ہیں؟ کیا سوچ رکھتے ہیں؟ جن کے اثرات آج تک موجود ہیں کہ برصغیر کی کوئی بھی تحریک اُن کے نام سے اپنا تعلق جوڑے بغیر اپنے آپ کو مستند نہیں بنا سکتی کہ اس کی سند مشکوک سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے ہر ایک اپنے آپ کو مستند قرار دینے کے لیے اور منوانے کے لیے اُن کا نام لے گا۔

اس لیکچر سیریز کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ان کی شخصیت اور فکر کا علم ہو۔ اُن کے نظریات سے واقفیت ہو، جو معاشرے کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں، اُن کے علمی نظریات بھی ہیں، لیکن خاص طور پر ان نظریات سے آگہی ہو، جن کا سوسائٹی سے تعلق ہے، آج سوسائٹی کو ایک نئی تشکیل کی ضرورت ہے۔ ہمارا سماج بہت ہی بودا ہو چکا

ہے۔ بہت ہی مضمحل ہو چکا ہے۔ اب اس کی ریفارمیشن (reformation) نہیں ہوسکتی۔ اس کی مرمت و اصلاح نہیں ہوسکتی۔ اس کی مکمل طور پر نئی تشکیل کرنے کی ضرورت ہے۔ تو وہ نئی تشکیل کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سوال ایک عرصے سے موجود تھا۔ اَور لوگوں نے بھی اس موضوع پر بات کی۔ ڈاکٹر اقبال نے اپنے خطبات کا عنوان بھی یہ رکھا ''تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ''۔ اس کا مطلب یہ سوال سوسائٹی کے اندر موجود ہے۔

تشکیل جدید کے حوالے سے ہمیں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ہاں پوری ایک فکر ملتی ہے۔ پورا ایک نظام ملتا ہے۔ اس وجہ سے اس سیریز کا مقصد ہمیں اس چیز کی طرف دعوتِ فکر دینا ہے کہ ہم اس موضوع پر سوچیں۔ اس موضوع پر ہمیں پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موضوع پر تبادلہ خیالات کی ضرورت ہے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ ہمیں آج کے مسائل کا اُن سے ربط تلاش کرنا ہے۔ پھر اُس کے حل کی طرف بڑھنا ہے۔ ایک بہت بڑی علمی کاوش کی ضرورت ہے۔

جب تک علم نہیں ہوگا، فکر نہیں ہوگا، تحریک کچھ مفید نہیں ہوگی۔ ہمارے ہاں تحریک چلانے پر بہت زیادہ زور ہے۔ ایک تحریک چلتی ہے، پھر دوسری چل پڑتی ہے، پھر کسی اَور ٹائٹل سے چل پڑتی ہے، تو ہماری مثال اُس ایک لطیفے کی صورت بن جاتی ہے کہ 1948ء میں ہمارے ہاں سے کچھ مجاہدین گئے تھے کشمیر کو آزاد کرانے کے لیے، تو ہمارے ایک مجاہد کے ہاتھ میں ایک ہندو بنیا آ گیا۔ اُس ہندو بنیے کی خوب پٹائی کی گئی۔ اُسے کہا گیا کہ کلمہ پڑھے تو پہلے تو وہ مزاحمت کرتا رہا۔ جب بہت زیادہ مار کھا لی تو اُس نے ہمارے مجاہد بھائی سے، جو شمالی وزیرستان کے علاقے سے تعلق رکھتا تھا، کہا جی پڑھائیں خان صاحب! کیا پڑھنا ہے؟ کہا: اوہو! وہ تو مجھے بھی نہیں پتہ، آؤ! مولانا صاحب سے پوچھتے ہیں کہ کیا پڑھنا ہے۔ تو ہمارا حال بھی یہی ہے۔ اسلام، اسلام، اسلام، کوئی پوچھے بھئی کہ یہ ہے کیا؟ کہیں گے چلیں جی فلاں صاحب سے جا کر پوچھتے ہیں کہ وہ ہے کیا چیز؟۔ تو پھر وہ جو بتاتا ہے، وہ ایک فساد ہوتا ہے، یوں ایک شغل شروع ہو جاتا ہے۔ بہر حال ہمیں ان چیزوں پر سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔

ہم بہت ممنون ہیں کہ اپنے بڑے مصروف شیڈول میں سے حضرت مفتی صاحب نے وقت نکالا اور ہم نے اُن سے استفادہ کیا۔ آج چوتھا لیکچر ہے۔ اس کا تعلق خاص طور پر سوسائٹی کی تشکیل سے ہے۔ شاہ صاحبؒ کا اپنا ایک خاص عنوان ہے ''ارتفاقات'' کا۔ اس کی وضاحت بھی ہوگی۔ اس کے مختلف مراحل کی بات بھی ہوگی اور سوسائٹی میں اس کے اطلاق کی بات بھی ہوگی۔ موضوع کی اہمیت کے حوالے سے یقیناً آپ مستفید بھی ہوں گے۔

ہم یہ چاہیں گے کہ آپ نے چار دن یہ ساری گفتگو سنی ہے، تو اپنے تأثرات ہمیں لکھ کر دیں کہ آپ نے کیا محسوس کیا؟ آئندہ کے لیے اپنے ذہن میں اگر کوئی تجاویز ہیں، وہ دیں، ان شاء اللہ ہم اساتذہ موجود ہیں، شعبہ موجود ہے، تاکہ ان چیزوں کی روشنی میں جو آپ حضرات کی بہتری کے لیے ہوگا، ہماری بہتری کے لیے ہوگا، سوسائٹی کی بہتری کے لیے ہوگا، ہم اس کو مستقبل کے حوالے سے روبہ عمل لاسکیں۔ بہت شکریہ!

----

www.rahimia.org

خطبۂ مسنونہ

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہٖ الکریم. اما بعد!

فأعوذ باللّٰہ من الشّیطان الرّجیم. بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم. قال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ:
قُلْ يَآيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (1)

و قال النّبیّ ﷺ: ''کانت بنو إسرائیل تسوسھم الأنبیاء، کلّما ھلک نبیّ خلفہٗ نبیّ آخر. ألا! لا نبیّ بعدی، سیکون بعدی خلفاء فیکثرون.'' (2)

و قال النّبیّ ﷺ: ''لا تزال طائفۃ من اُمّتی قائمین علیٰ الحقّ، لا یضرّھم من خالفھم.'' (3)

صدق اللّٰہ العظیم و صدق رسولہٗ النّبیّ الکریم.

www.rahimia.org

سماجی اور عمرانی معاہدے کی اہمیت

صاحبِ صدر اور معزز حاضرین، خواتین و حضرات!

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار و تعلیمات کے حوالے سے یہ چوتھا لیکچر سوسائٹی کی اجتماعی تشکیل کے حوالے سے ہے۔ پہلے روز کے لیکچر میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی سوسائٹی کا جو تحلیل و تجزیہ پیش کیا ہے، اس کے مطابق اس معاشرے میں فکری انتشار، سیاسی اضمحلال اور معاشی عدمِ اطمینان کی کیفیت تھی۔ گویا کہ سوسائٹی کی اجتماعی شیرازہ بندی دِگرگوں تھی۔ انتشارِ فکر، فرقہ واریت، گروہیت، طبقاتی نظام اور فرسودہ خیالات و تصورات کے سبب سوسائٹی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اب ایک ایسے معاشرے میں جہاں مختلف مذاہب، مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف تہذیب و ثقافت سے وابستہ لوگ برعظیم پاک و ہند میں بستے ہیں، ان کے لیے ایک سماجی اور عمرانی معاہدہ (Social Contract) اور ان کی اجتماعی تشکیل کا ایک نیا قاعدہ، ضابطہ اور سسٹم قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ اُس دور کا تقاضا تھا۔ اس تقاضے کی تکمیل کے لیے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنا فلسفہ وفکر مرتب کیا۔

دوسرے لیکچر میں شاہ صاحبؒ کا جو فلسفہ وفکر ہے، اس کا ایک مربوط خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اُس میں انسانوں کے اجتماعی تقاضوں کی تکمیل کی ایک اہم ترین بحث ''مبحث الارتفاقات'' کا بھی ذکر کیا گیا تھا کہ یہ ایک مستقل موضوع کا تقاضا کرتا ہے۔ آج اسی عنوان پر ہم گفتگو کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس مبحث میں شاہ صاحبؒ نے اپنا فلسفہ اجتماع مرتب کیا ہے۔ اس کی اس حوالے سے بھی اہمیت ہے کہ شاہ صاحبؒ ہی کا ہم عصر روسو 1712ء میں پیدا ہوا اور 1778ء میں اُس کا انتقال ہوا۔ جب کہ شاہ صاحبؒ کی پیدائش 1703ء کی ہے اور 1762ء میں انتقال ہوا۔

یورپ کی سوسائٹی کا تحلیل و تجزیہ کرکے، وہاں کے مسائل کے تناظر میں ایک نئے معاہدۂ عمرانی (Social Contract) پر

روسو نے 1762ء میں اپنی کتاب فرانسیسی زبان میں شائع کی۔ اُسی کے زیرِ اثر انقلابِ فرانس سے یورپ کی اجتماعی تشکیل کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ جو نہ صرف یورپین ممالک میں، بلکہ پھیلتا ہوا دنیا میں جن جن خطوں اور ممالک پر یورپ کا تسلط رہا، آج بھی قائم ہے۔ برطانیہ کے زیرِ انتداب (نگرانی) رہنے والے ممالک میں دولتِ مشترکہ کے رُکن ملکوں میں اُسی طرح قائم ہے۔

شاہ صاحبؒ کے فلسفۂ اِجتماع کا پسِ منظر

برعظیم پاک و ہند کے اس خطے کے اجتماعی تقاضے کیا تھے، بلکہ کل انسانیت کے اجتماعی تقاضے کیا ہیں؟ اُن کے لیے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جو فلسفۂ اِجتماع مرتب کیا اور معاہدۂ عمرانی کی بنیادی تشکیل پیش کی، اُسے سمجھا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ شاہ صاحبؒ کی ان تعلیمات کی اساس، دین اسلام ہے۔

یورپین فلسفۂ اِجتماع کی نوعیت

مغرب کی تعلیمات، اس کے فلسفہ و فکر کی اساس، جیسا کہ کل گفتگو میں عرض کیا گیا تھا، یورپ میں ابھرنے والے اُن فلسفیوں کے افکار رہے، جنھوں نے یورپ کی نشاۃِ ثانیہ میں بنیادی کردار ادا کیا۔ جن میں ''نظریۂ مادیت'' کہ مادی نقطہ نظر سے چیزوں کا مشاہدہ کرنا اور روح کا انکار کرنا اور ''نظریۂ ارتقا''، انسان کو صرف سماجی حیوان (Social Animal) قرار دے کر اُس کے حیوانی تقاضوں کی تکمیل کے امور متعین کرنا ہیں۔ یورپین معاہدۂ عمرانی کے امور اسی حوالے سے ترتیب دیے گئے ہیں۔ جو قوانین اور ضابطے حیوانی دور میں رہے ہیں، انھیں ہی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً Might is Right کہ طاقت ور ہی حکمران ہوتے ہیں۔ طاقت کی اساس پر ہی سیاسی نظام قائم ہوتے ہیں۔ جیسے جنگل میں جانوروں میں ایسے جانور کی بادشاہت ہوتی ہے، جو وہاں درندہ طاقت کے بل بوتے پر حکمران ہوتا ہے۔ یہی حیوانی قانون اور ضابطۂ حکمرانی یورپین حکمران طبقات کی تشکیل کی اساس بنا۔ بہ ظاہر اُسے ''اجتماع'' اور ایک ''معاہدۂ عمرانی'' (Social Contract) کہا گیا، لیکن اس معاہدے میں بھی طبقاتی طاقت فیوڈل لارڈز سے نکل کر مرکنٹائل ازم چلانے والی بزنس کمیونٹی کے قبضے میں چلی گئی۔

یورپ میں 1776ء میں ایڈم سمتھ کی کتاب ''دولتِ اقوام'' آتی ہے، جس کے نتیجے میں مرکنٹائل دور کے بزنس مینوں کی اساس پر قائم طاقت فیوڈل لارڈز سے نکل کر زر پر کنٹرول رکھنے والی قوتوں کے قبضے میں چلی گئی۔ پھر جیسے ہی آگے چل کر سرمائے (capital) کی طاقت تخلیق پذیر ہوتی ہے تو یہ طاقت سرمایہ دار (capitalist) کے پاس چلی گئی۔

مخصوص طبقے کی آمریت یا جمہوریت

کہنے کو اُسے بہ ظاہر ایک معاہدۂ عمرانی کہا جاتا ہے، لیکن اس معاہدے کے دونوں فریق کے حقوق برابر نہیں ہیں۔ جمہوریت کا وہ نظام، جس میں سرمائے، جاگیر یا مذہبی پاپائیت کا جبر ہو، کہنے کو اُس کا نام جمہوریت ہے، لیکن سرمائے کے جبر سے قائم ہونے والی سیاسی طاقت، اجتماعی شیرازہ بندی کا کردار کیسے ادا کرسکتی ہے؟ اگر آج سے دس سال پہلے ہارنے والا امریکی صدارتی اُمیدوار یہ کہے کہ: ''چھ ملین ڈالر میرے پاس ہوتے تو میں امریکا کا صدر بن جاتا۔'' اس کے یہ جملے تاریخ میں محفوظ ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ مغرب اور اس کا ہم نوا سیاسی نظام عام انسانوں کی جمہوری رائے کی اساس پر نہیں، بلکہ جاگیردار (Land

www.rahimia.org

(Lord) یا حکمران طبقہ (Ruling Class) سے تعلق رکھنے والے افراد، جمہوریت کے نام پر سیاسی، معاشی اور سماجی اداروں کی تشکیل کر رہے ہوتے ہیں، جس کے نتیجے میں کیپٹل اِزم، یعنی طبقات کے حامل اُمرا، لینڈ لارڈز، بزنس مین یا کیپٹلسٹ طاقت و قوت والے حکمران بن جاتے ہیں۔ حکمرانی کے تمام قاعدے اور ضابطے ان کے مفاد کے لیے کام کرتے ہیں۔

مارکسی فلسفۂ اِجتماع

اس کے ردّعمل میں یورپ میں اسی مادی فلسفہ اجتماع پر مارکس نے جدلیت (Dialectical) کی اساس پر جو نظام تجویز کیا تھا، جس کو سوشلزم یا اشتراکیت کہا گیا تو وہاں بھی پرولتاریہ کے نام پر آمریت قائم کی گئی تھی اور پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ نافذ کی گئی۔ گویا عام انسانوں کے انسانی حقوق اور تمام جمہور کے حقوق اور مفادات کا یہ عمرانی معاہدہ ہے ہی نہیں، بلکہ پرولتاریہ کی آمریت ہے یا ایک مخصوص پارٹی کی طبقاتی آمریت ہے۔

اب اس تناظر میں یہ جو دو ڈھائی سو سالہ دور گزرا ہے، اس میں فلسفۂ اِجتماع یا سماجی تشکیلِ نو کا مرحلہ یورپ کے نقطہ نظر سے زیرِ بحث رہا۔ ایشیا اور افریقا کے عوام یا انسانوں کے نقطۂ نظر سے وہ فلسفۂ اِجتماع تشکیل نہیں دیا گیا۔ چوں کہ پورا ایشیا و افریقا یورپ کا غلام رہا ہے، اس لیے غلام اپنی آزادانہ رائے سے اپنا نظام قائم نہیں کرسکتا۔ خواہ وہ علم وفکر کے نام پر ہو، سیاست ومعیشت کے نام پر ہو۔ ایشیا اور افریقا کے ممالک میں اسی عمرانی فلسفے کو مسلط کر دیا گیا، عملاً بھی اور علماً بھی۔ تعلیمی ادارے بھی، تعلیم و تربیت بھی اسی نہج پر اور عملی ڈھانچہ بھی اس نہج پر قائم کیا گیا۔

دینی فلسفۂ اِجتماع کی ضرورت

اب ایسے ماحول میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دین اسلام کی تعلیمات اجتماعی نقطۂ نظر سے کوئی فلسفۂ اِجتماعیت دیتی ہیں؟ کل انسانیت کی فلاح و بہبود کا کوئی طریقۂ کار متعین کرتی ہیں؟ باقی مذاہب تو یورپین فلسفۂ اِجتماع کے تابع (surrender) ہو چکے ہیں۔ یہودیت، عیسائیت، ہندومت، بدھ مت، کنفوشس اِزم وغیرہ نے کہہ دیا کہ عبادت ہماری اور سیاست ومعیشت مغرب کی، گویا انھوں نے سمجھوتہ (compromise) کرلیا۔ کیا مسلمان ایسا کرسکتا ہے؟ جن کا دعویٰ ہے اور جو اس عقیدے پر یقین رکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے مبعوث ہوئے اور آپؐ کی تعلیمات کل انسانیت کے لیے ہیں۔ قرآن میں نبی اکرمؐ کو اللہ تعالی نے مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے:

قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (4)

(اے محمدؐ! کہہ دیجیے! میں تم تمام کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔)

آپؐ آخری نبی ہیں۔ آپؐ کی رسالت قیامت تک کے لیے ہے۔ آپؐ کے بعد کوئی نیا نبی آنے والا نہیں ہے۔ پھر مسلمانوں کا سیاسی نظام اور اجتماعیت گیارہ بارہ سو سال تک دنیا میں قائم بھی رہی۔ اس تناظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ دینِ اسلام کی تعلیمات کی اساس پر کل انسانیت کی فلاح و بہبود کا فلسفۂ اِجتماع کیا ہے؟

www.rahimia.org

فلسفۂ اِجتماع کی حقیقت اور نوعیت

بات یہ ہے کہ سوسائٹی بنتی ہے سماجی معاہدات کے مجموعے سے۔ ایک فرد دوسرے فرد کے ساتھ قدم قدم پر معاہدے میں بندھا ہوا ہے۔ معاہدے کے بغیر انسانی زندگی کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ میاں بیوی کے معاہدۂ نکاح، خریدار اور فروخت کنندہ کے معاہدۂ بیع، شہری سطح پر مختلف مارکیٹوں میں کام کرنے والے لوگوں کے درمیان سماجی معاہدات، صوبے اور ریاست میں حکومت اور عوام کے درمیان ہونے والے عمرانی معاہدات، ایک مملکت کے اندر قوم کی تشکیل کے سیاسی اور معاشی معاہدات، آئینی اور قانونی معاہدات اور ممالک اور اقوام کے درمیان بین الاقوامی معاہدات اور تعلقاتِ عامہ وغیرہ۔ ان معاہدات کے مجموعے کا نام سماج اور سوسائٹی ہوتا ہے۔ سوشیالوجی اس سے بحث کرتی ہے اور فلسفۂ اِجتماعیت اس کو ہدف بنا کر کام کرتا ہے۔ لہٰذا دینِ اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں کل انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے فلسفۂ اِجتماعیت کیا ہوگا؟

ارتفاقات پر مبنی امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا دینی فلسفۂ اِجتماع

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فلسفۂ اِجتماع یا سوسائٹی کے ان معاہدات کی اساسیات واضح کی ہیں۔ انھوں نے اپنے نظریۂ ارتفاقات میں فلسفۂ اِجتماعیت کی وضاحت کی ہے اور اس کے چار مراحل بیان کیے ہیں۔ ''ارتفاق'' کا لفظ بھی شاہ صاحبؒ کا اپنا خودساختہ نہیں ہے۔ یہ قرآن کا استعمال کردہ لفظ ہے۔ مسلمانوں کے لیے جہاں انعامات اور اچھی سوسائٹی کا تذکرہ آیا ہے، نیز جنت میں اچھے حالات کا تذکرہ آیا ہے، قرآن حکیم نے وہاں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ چناں چہ جہاں جہنم کے بُرے نتائج کا تذکرہ ہے، وہاں ''سَآءَتْ مُرْتَفَقًا''[5] (کیا ہی بُری آرام گاہ ہوگی) ذکر کیا گیا۔ پھر جنت کے انعامات بیان کر کے کہا گیا: ''حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا''[6] (کیا ہی اچھی آرام گاہ ہے)۔

ارتفاق کا مادہ ''رِفق'' سے ہے، یعنی آسانیاں اور سہولتیں پیدا کرنا۔ انسانی سوسائٹی کے تمام سماجی معاہدات اور تمام سطحوں میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچانا اور آسانیاں پیدا کرنا، خواہ یہ آسانیاں علمی سطح پر ہوں یا عملی حوالے سے ہوں۔ اسی طرح ارتفاقاتِ عقلیہ اور ارتفاقاتِ معاشیہ، یعنی عقلی مسائل اور عقلی عُقدے (cruxes) حل کرنے کے لیے جو قوانین اور ضابطے دریافت کیے جاتے ہیں، وہ عقل کے استعمال کی سہولتیں پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً ضرب، جمع، تقسیم وغیرہ کے لیے کلکولیٹر کی ایجاد جیسی جتنی بھی دریافتیں آئی ہیں، یہ انسان کی ذہنی استعداد کا اظہار اور ارتفاق ہے۔ اسی طرح آج کمپیوٹر کا وجود میں آنا ہے۔ یہ وہ ارتفاقات یا سہولتوں کا نظام ہے، جس سے دماغی کام میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے عقلی مسائل جلد حل ہوتے ہیں۔ عقلی مشکلات کے حل کرنے کا جو صحیح طریقِ کار (method) ہے، وہ ''ارتفاقاتِ عقلیہ'' کہلاتا ہے۔

انسان کی دو خصوصیات؛ قوتِ عقلیہ اور عملیہ

انسان کی دو بنیادی خصوصیات امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بیان فرمائی ہیں کہ انسان حیوانیت سے جب ممتاز ہوتا ہے تو ایک تو اُس میں ''زیادة القوّة العقلیه''، یعنی اس کی قوتِ عقلیہ زیادہ اور بہتر ہوتی ہے۔ اور دوسرا ''براعة القوّة العملیه''، یعنی قوتِ عملیہ کی مہارت اور صلاحیت ہے۔ [7] قوتِ عقلیہ کے لیے سہولتوں کا جو نظام بنایا جاتا ہے، اُسے ''ارتفاقاتِ عقلیہ'' کہا جاتا

www.rahimia.org

ہے۔ اس سے عقل کو کام کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ اس کو اگر کوئی مشکل درپیش ہو رہی ہے، تو اس کو حل کرنے کا طریقہ اس کے سامنے آجائے۔ اسی طرح عملی مشکلات اور مسائل حل کرنے کے لیے جو سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں، انھیں ''ارتفاقاتِ معاشیہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ ارتفاقات سوسائٹی کے سماجی معاہدات کی تکمیل کے لیے تمام سہولتوں کے نظام کا کردار ادا کرتے ہیں۔

نوعِ انسانی کی تین بنیادی خصوصیات

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ انسان کو حیوان سے ممتاز کرنے والے بنیادی امور تین ہوتے ہیں۔ ان امور کی وجہ سے انسان اجتماعی معاملات اور ارتفاقات میں منہمک ہوتا ہے:

1۔ اجتماعی مفاد کا لحاظ

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ انسانوں میں ''الرّأی الکُلّی'' (رفاہِ عامہ) کا تصور پایا جاتا ہے۔ یعنی اجتماعی مفاد کے لیے کام کرنا، خواہ وہ گھر کے تمام افراد کے لیے ہو، سوسائٹی میں مارکیٹ کے لوگوں کے لیے ہو، ملکی سطح کے افراد کی اجتماعیت کے لیے ہو، قومی سطح کے تناظر میں ہو، یا بین الاقوامی سطح کے تعلقات کے حوالے سے ہو۔ اجتماعی مفادِ عامہ اور ''الرّأی الکُلّی'' کی ضد ''الرّأی الجُزئی'' ہے کہ انسان صرف ذاتی مفاد کے لیے کام کرے۔ یہ انسانی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ حیوانی عادت ہے۔ حیوان ہمیشہ صرف اور صرف اپنے ذاتی مفاد کے لیے کام کرتا ہے۔ اس میں اجتماعیت کا وہ درجہ نہیں پایا جاتا کہ وہ دوسروں کی سہولت، دوسروں کے فائدے، اُن کے مفاد کے لیے کسی قسم کا کوئی کام کرے۔ نہ اُس کی ایسی استطاعت ہے، نہ اُسے ضرورت ہے۔ انسان میں جیسے ہی اجتماعی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، تو اس میں مفادِ عامہ، اجتماعی فلاح و بہبود، اجتماعی تصور کے تحت سوسائٹی کی تشکیل دینے کا عمل پایا جاتا ہے۔

2۔ ایجاد و تقلید کا مادہ

دوسری اہم ترین خصوصیت، جو جانوروں میں نہیں ہے، انسانی سطح پر پائی جاتی ہے، وہ ایجاد و تقلید کا مادہ ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے اور نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں تو وہ نئی نئی ایجادات وجود میں لاتا ہے، نئی دریافتیں سامنے آتی ہیں، تخلیقات کرتا ہے، اجتماعی غور و فکر کے نتیجے میں نئی سے نئی ایجادات اور نئی سے نئی ٹیکنالوجی سامنے آتی ہے۔ انسان کی اجتماعیت کا دوسرا اہم ترین دائرہ ایجادات کی تخلیق ہے۔ پھر وہ پیدا شدہ یا دریافت شدہ ایجادات کی تقلید اور اتباع کرتا ہے۔ جب بھی کوئی نئی چیز، نئی ٹیکنالوجی سامنے آتی ہے اور لوگوں کو اُس سے کچھ سہولت ملتی ہے تو لوگ اس کی تقلید کرتے ہیں مثلاً فوراً اُسے خرید لیتے ہیں جیسے آج سے تیس چالیس سال پہلے موبائل فون کا کوئی تصور نہیں تھا۔ انسانی سہولت کی یہ چیز آئی تو لوگوں نے دھڑا دھڑ اس کی خریداری کی۔ آج ہر آدمی موبائل لیے پھرتا ہے۔ تو ایجاد و تقلید کا مادہ اس میں پایا جاتا ہے۔

3۔ حُبِّ جمال اور خوب سے خوب تر کی تلاش

تیسری بڑی خصوصیت جو شاہ صاحب واضح کرتے ہیں، اجتماعیت کے ارتقا اور ترقی میں، وہ یہ کہ انسان خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس میں ''حُبِّ جمال'' ہے۔ ضرورت تو ایک ناقص ادھوری چیز سے بھی پوری ہوسکتی ہے، لیکن وہ اس میں

www.rahimia.org

خوب صورتی چاہتا ہے، نزاکت چاہتا ہے، شفافیت چاہتا ہے، حسن چاہتا ہے، جمال کا گرویدہ ہے۔ اچھا مکان، اچھا لباس، اچھی چیزیں۔ اور پھر اُن کے لیے چیزوں کو ایجاد کرتا ہے اور پھر اُن کی تقلید کرتا ہے۔ یہ اجتماعی رویہ ہے۔

شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ ان تین خصوصیات کی وجہ سے انسان جب اپنی اجتماعیت قائم کرتا ہے تو اس کی چار بنیادی سطحیں ہیں، جنھیں شاہ صاحبؒ نے ''ارتفاقات'' کا عنوان دیا ہے:

1۔ ارتفاقِ اوّل 2۔ ارتفاقِ دوم 3۔ ارتفاقِ سوم 4۔ ارتفاقِ چہارم

ارتفاقِ اوّل اور اس کے بنیادی اُمور

حضرت آدم علیہ السلام کو سب سے پہلے یہ ارتفاقات سکھانے سے متعلق اللہ پاک نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

''عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا''[8] (اللہ نے آدم کو تمام اسماء سکھائے۔)

اس کی تشریح کرتے ہوئے ''تفسیر جلالین'' میں امام جلال الدین سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ تمام اسما سکھائے، ''**حتّٰی القصعة و القصیعة ... و المغرفة**''[9] (یہاں تک کہ پیالہ اور پیالی اور چمچہ وغیرہ) برتن کے استعمال کے طریقے وغیرہ وغیرہ تک ''اَسماء'' میں شامل ہیں۔ یعنی جو امور و آلات انسانی اجتماعیت کی تشکیل کے لیے ضروری تھے، وہ سکھائے گئے، جن کو انھوں نے استعمال میں لا کر سوسائٹی کی ترقی کے لیے کردار ادا کیا۔ سب سے پہلے وہ بنیادی اساسی امور ہیں، جو انسانیت سے وابستہ ہیں۔ اور اُس سے متعلقہ جتنے اوزار یا اشیاء وجود میں آئیں۔ ان تمام چیزوں کا تعلق اجتماع سے ہے۔ یہ ارتفاقِ اوّل ہے۔ جس کے بنیادی امور کو ارتقا کے مختلف مراحل سے گزارا گیا:

انسانیت کی سطح پر زندگی کے آتے ہی ان امور میں سب سے پہلا اجتماعی پہلو لغت اور زبان سے اظہار ہے۔ جس سے انسان اظہار مافی الضمیر کرتا ہے۔ دوسرے کے ساتھ اس کا انٹریکشن زبان سے ہوتا ہے۔ ورنہ خود کو مثلاً پیاس لگی ہے، اٹھ کر پانی پی لے، اسے بولنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح کھانے کے لیے خود کوئی کام شروع کر دے۔ اس طرح اُسے اظہار مافی الضمیر کی ضرورت نہیں رہتی۔ انسان بولتا تبھی ہے، جب وہ کسی دوسرے انسان کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے اور اپنی دلی کیفیت، اندرونی حالت کو دوسرے سے شیئر (share) کرنا چاہتا ہے تو اُسے بیان کرتا ہے۔ ارتفاقِ اوّل کی پہلی بنیادی چیز لغت اور زبان ہے۔ پھر اس لغت پر بھی شاہ صاحبؒ نے ''**التّفهيمات الإلٰهيه**'' میں بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ماہرینِ لسانیات کے مطابق لغات اور لسانیاتی اظہار کی کئی اقسام ہیں۔ یہاں شاہ صاحبؒ انسانی زندگی کے ابتدائی دور میں بننے والی اصل لغت اور لسانی ساخت کے وجود میں آنے کے اصول بیان کر رہے ہیں۔

آج ماہرین لسانیات اس پر گفتگو کرتے ہیں۔ کس اساس پر زبان بنی؟ حلق کے نچلے حصے یعنی اقصائے حلق سے لے کر ان ہونٹوں تک حروفِ تہجی کی تقسیم اور ترتیب کیوں کر وجود میں آئی؟ انسان نے اپنے ضمیر میں محفوظ معانی کو زبان دینے اور ان کے اظہار کرنے کے لیے کون کون سے طریقے اور ٹیکنیکس استعمال کیں۔ لسانیات کے ارتقا کی پوری تاریخ اس لفظِ ''لغت'' کے اندر محفوظ ہے خواہ وہ کوئی بھی زبان ہو۔

www.rahimia.org

اس کے علاوہ انسان میں کھانے، پینے، پہننے، گرمی سردی سے بچاؤ اور نسل کی بڑھوتری کے لیے امور ہیں، کاشت کاری ہے، صنعت ہے، تجارت ہے، قانون اور رسم و رواج کی ضرورت ہے، جس کے تحت افراد کے درمیان اختلافی مسائل کو حل کرنے کی سوچ موجود ہے۔ آلات اور اوزار ہیں، جن کو وہ اپنی ان تمام ضروریات کی کفالت کے لیے استعمال میں لاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ الغرض گیارہ کے قریب بنیادی امور، جن کا تعلق اُس کی سماجی سرگرمیوں سے ہے۔

ارتفاقِ اوّل میں دوسرے انسانوں سے ہمارا جو اجتماعی ربط (interaction) ہوتا ہے، اس کے کل گیارہ بنیادی امور شاہ صاحبؒ نے متعین کیے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''**حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه**'' میں فرماتے ہیں:

''(1) (**لغت اور لسانیاتی اظہار:**) ارتفاقِ اوّل میں سے (سب سے پہلے) وہ زبان اور لغت ہے، جس سے انسان اپنے دلی جذبات اور ذہنی خیالات کو الفاظ کے ذریعے بیان کرتا اور ان کا اظہار کرتا ہے۔

(یاد رہے کہ) اس سلسلے میں درجِ ذیل اصول کارفرما ہوتے ہیں:

(الف) ایسے افعال، شکلیں اور اجسام، جن سے کسی بھی طرح کی آواز نکلتی ہے۔ ایسی آواز یا تو ان چیزوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہے، یا اُن کے سبب سے پیدا ہوتی ہے، یا ان اشیا کے کسی اَور تعلق کی وَجہ سے پیدا ہو رہی ہوتی ہے۔ انسان ان آوازوں کی ہو بہو نقل اُتارتا ہے۔ اس سے مصدر وجود میں آتے ہیں اور پھر ان سے مختلف معانی کے لیے مختلف صیغے (ماضی وغیرہ) اور دیگر الفاظ بنائے جاتے ہیں۔

(ب) ایسے کام اور امور جو آنکھوں کے سامنے بڑی مؤثر شبیہ بنائیں، یا پہلے مرحلے میں انسانی دل میں کوئی وجدانی اور جذباتی کیفیات پیدا کریں، انسان اس مؤثر شبیہ اور وجدانی کیفیت کو اپنی آواز کی صورت میں بیان کرتا ہے۔

(ج) پہلے دو اُمور کی بنیاد پر وجود میں آنے والے الفاظ کو وسیع تر معانی اور مفاہیم کے لیے مجازی طور پر اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ وہاں کسی مشابہت یا تعلق کی وَجہ سے کوئی قرینہ پایا جاتا ہے۔

لغات سازی کے چند مزید اصول بھی ہیں، جو ہم نے اپنی دوسری کتابوں (البُدور البازغہ، ص: 67 وغیرہ) میں بیان کیے ہیں۔

(2) (**غذائی ضروریات کا انتظام:**) کاشت کاری کرنا، درخت لگانا، کنوئیں کھودنا اور کھانے پکانے اور سالن وغیرہ بنانے کے طور طریقے اختیار کرنا۔

(3) (**استعمال کے برتن وغیرہ:**) برتن بنانا اور (پانی کے لیے) مشکیزے وغیرہ بنانا۔

(4) (**اپنی ضروریات کے لیے حیوانات کی دیکھ بھال:**) جانوروں سے کام لینا اور اُن کی اس لیے دیکھ بھال کرنا، تاکہ اُن پر سوار ہو سکے، اُن کا گوشت کھائے، اُن کے چمڑوں کو استعمال کرے، اُن کے بالوں، اُون، دودھ اور اُن کی نسلوں کو اپنے زیرِ استعمال لانا۔

(5) (**رہائش کا بندوبست:**) ایسا مکان بنانا، جو گرمی اور سردی سے حفاظت کرے۔ وہ مکان خواہ غاروں کی صورت

میں ہو، یا گھاس پھونس وغیرہ سے بنایا جائے۔

(6) (لباس کی تیاری:) ایسا لباس تیار کرنا، جو انسان کے ننگے بدن کی حفاظت کرے، خواہ وہ جانوروں کی کھال سے بنایا گیا ہو، یا درخت کے پتوں سے بدن کو ڈھانپے، یا (دھاگے سے بُن کر) ہاتھوں سے تیار کیا گیا ہو۔

(7) (بیوی کا تعین:) مرد کا اپنے لیے ایسی بیوی کا تعین کرنا، جس میں کوئی دوسرا مرد اُس کے ساتھ شریک نہ ہو۔ پھر وہ اُس کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرکے اپنی نسل بڑھائے۔ اور خاتونِ خانہ گھریلو زندگی، بچوں کی پرورش اور تربیت وغیرہ میں اُس کی مدد کرے۔ انسانوں کے علاوہ نر جانور اپنے لیے کسی مادہ کو متعین نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ اتفاقیہ طور پر وہ دونوں جانور اکٹھے رہتے ہوں، یا وہ دونوں پیدائشی طور پر جڑواں ہونے کی وَجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوں وغیرہ۔

(8) (اَوزار اور آلات کی تیاری:) انسان ایسے اوزار بناتا ہے کہ جن سے کاشت کاری، درخت لگانے، کنوئیں کھودنے، جانوروں کو اپنے زیرِ استعمال لانے وغیرہ کے کام ہوتے ہیں۔ مثلاً کدال، ڈول، ہل چلانے کا پھلا اور رَسیاں وغیرہ۔

(9) (تعاونِ باہمی اور خرید وفروخت:) ایک دوسرے سے مال کا تبادلہ اور خریداری کرنا اور بعض کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاونِ باہمی وغیرہ۔

(10) (اجتماعی نظم ونسق کے لیے سربراہ کا انتخاب:) درست رائے اختیار کرنے کا ماہر اور مضبوط طاقت وقوت والا فرد اپنی قوم کا سربراہ بن جائے اور لوگ کسی نہ کسی طریقے سے اُسے اپنا سردار اور سربراہ مان لیں۔

(11) (تسلیم شدہ قانون کا ہونا:) اُن میں ایسا تسلیم شدہ قانون ہو، جو اُن کے جھگڑوں کو نمٹانے، سوسائٹی پر ظلم کرنے والے اور لڑائی جھگڑے کا ارادہ کرنے والے کا مقابلہ کرے اور کمزور آدمیوں کا تحفظ کرے۔'' (10)

ارتفاقِ ثانی اور اس کے بنیادی اُمور

ارتفاقِ اوّل کے پہلے مرحلے میں جو بنیادی اجتماعی امور ہیں، انھیں جب اگلے مرحلے میں مذکورہ بالا تینوں انسانی خصوصیات کے تناظر میں پرکھا گیا تو اس سے ارتفاق کا اگلا مرحلہ وجود میں آتا ہے، جسے شاہ صاحبؒ کی اصطلاح میں ''ارتفاقِ ثانی'' کہا جاتا ہے۔ اجتماعی مفادِ عامہ کے تناظر میں چیزوں کا جائزہ لینا۔ اس نقطۂ نظر سے جو چیز قرار واقعی ہے، اُسے قبول کرنا اور جو کمزور اور ناقص اور ''رأیِ جزئی'' کی بنیاد پر ہے، اسے چھوڑ دینا۔ اسی طرح نئی ایجاد کے تناظر میں پُرانی ایجادات یا پُرانی چیزوں کی تقلید چھوڑ دینا، فرسودہ طریقوں کو پس پشت ڈال دینا۔ اسی طرح خوب صورتی اور جمال کے تحت جب تجزیہ کیا تو بدصورت چیز کو چھوڑ کر اگلی ترقی یافتہ اور خوب صورت چیز کی طرف چلے جانا۔ ارتفاقِ ثانی کی سطح پر افراد کی جماعتی زندگی مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔ اس مرحلے پر جتنے امور ہوتے ہیں، اُن کا تعلق ''حکمت'' (Science) سے ہوتا ہے۔

حکمت کی تعریف شاہ صاحبؒ نے کی کہ جہاں عقل کا استعمال ہو اور اجتماعی مفاد پیش نظر ہو اور اس تناظر میں چیزوں کو پرکھنا

www.rahimia.org

اور اُن کا ٹھیک ٹھیک استعمال کرنا۔ اس لیے عربی میں اس کی تعریف کی جاتی ہے کہ:

''معرفة الحقائق کما ھی، و وضعھا علیٰ محلّھا علی الصّواب.'' (11)

(حقائق کی کما حقہ معرفت حاصل کرنا اور ان کو اپنے محل پر درست طریقے سے رکھنا۔)

یعنی گرد و پیش کی اشیا، چیزوں اور ماحول کو حقائق کے تناظر میں پرکھنا، اُن کی معرفت حاصل کرنا اور اس طرح علم حاصل کرنا جیسا کہ وہ واقع میں ہیں۔ محض عقیدت کے تصورات کے تناظر میں نہیں بلکہ حقائق کے تناظر میں چیزوں کا جائزہ لینا۔ دستیاب اشیا اور ماحول کے تناظر میں ان چیزوں کو ایسے درست طریقے سے استعمال میں لانا کہ وہ انسانیت کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید اور اجتماعی مفاد کے لیے زیادہ بہتر ثابت ہوں۔

اس کے نتیجے میں شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ انھی امور کو جب نکھارا گیا ہے تو معاشیات کے شعبے وجود میں آئے (جن کی تفصیلات کل کے لیکچر میں بیان کی گئی تھیں)۔ دولت کی پیدائش سے متعلق پیشے وجود میں آئے۔ دولت کی تقسیم، اشیا کی تجارت، وسائل کی دستیابی اور اُس کے استعمالات سے متعلق اُمور رفاہی شکل میں اگلے مرحلے میں داخل ہوئے۔

گھریلو نظام جو ارتفاقِ اوّل میں محض میاں بیوی کے معاہدے تک محدود تھا، وہ ارتفاقِ ثانی میں مزید بہتر بنا۔ اولاد کے ماں باپ پر کیا حقوق ہیں؟ ماں باپ کے کیا حقوق ہیں اولاد پر؟ گھر چلانے کے لیے، نظم و نسق چلانے کے لیے اس کی معاونت اور تعاون کرنے والے افراد کے کیا حقوق ہیں؟ معاشی وسائل ایک خاندان کیسے حاصل کرے گا؟ ان دستیاب معاشی وسائل کو وہ خاندان کے فائدے کے لیے کیسے استعمال میں لائے گا؟ اس سطح پر یہ اجتماعی تقاضے نئی شکل میں ابھرے، جن کے لیے شاہ صاحبؒ نے لفظ استعمال کیا ہے ''تـدبیـرُ الـمـنـزِل'' یعنی گھریلو نظام، یا ایک خاندان یا قبیلے کا نظام تشکیل دینا اور اُس کی تمام ضروریات کی کفالت کے لیے اس سطح کی اجتماعیت کو ترقی دینا۔

ارتفاقِ ثانی میں صرف خاندانی نظام ہی نہیں بلکہ اس مرحلے پر معاشی شعبوں کی ذیلی جماعتیں وجود میں آئیں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ تمام انسان اپنی تمام ضرورتیں ازخود پوری نہیں کر سکتے، انھیں دوسرے انسانوں سے تعاون کی ضرورت ہے تو اب اس مرحلے پر آ کر انسانوں نے پیشے متعین کر لیے تا کہ زیادہ مہارت، زیادہ جمالیاتی حس، مفادِ عامہ کے لیے زیادہ بہتر کام، زیادہ اچھے طریقے سے ایجادات اور تقلید کا عمل وجود میں آئے تا کہ ذہن ایک ہی کام پر مرتکز (focus) ہو جائے۔ مثلاً کپڑا بُننے والوں کی الگ جماعت بن گئی۔ زراعت اور کاشت کاری کرنے والے لوگوں کی الگ سے جماعت وجود میں آ گئی۔ تاجروں کی الگ سے جماعت وجود میں آ گئی جو تجارت کے شعبے کو نکھارتے ہیں۔ دست کاری اور صنعت سے متعلق جو امور تھے، ان میں بھی الگ الگ جماعتوں کی صورت شروع ہو گئی۔ کوئی لباس بنائے گا۔ کوئی جوتا بنائے گا۔ کوئی فرنیچر بنائے گا وغیرہ وغیرہ۔ کیوں کہ جب آدمی اپنی پوری توجہات ایک ہی علم و فن یا ہنر پر فوکس کر لیتا ہے تو اس میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایجاد و تقلید کا بنیادی جذبہ آگے بڑھتا ہے۔ مفادِ عامہ کی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ جمالیاتی حس ترقی کرتی ہے۔

ارتفاقِ دوم کے پانچ بنیادی شعبے

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک جب انسان اپنی طبعی ابتدائی ضرورتیں حاصل کرلیتا ہے تو اجتماعی زندگی کی اصلاح کے تجربے کرتا ہے۔ وہ ارتفاقِ اوّل کے امور اور چیزوں کو زیادہ صفائی اور عمدگی کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح وہ ارتفاقِ دوم میں ترقی کرتا ہے، جسے حضرت شاہ صاحبؒ مندرجہ ذیل پانچ شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں:

1۔ حکمتِ معاشیہ Science of Livelihood

حکمتِ معاشیہ کی تعریف اور اُس کی دیگر تفصیلات امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے معاشی افکار پر مبنی گزشتہ لیکچر میں بیان کی جاچکی ہے۔ اس کے ذیل میں کھانے پینے، مکان، لباس اور معاشی ضروریات سے متعلق مباحث بیان کی گئی ہیں۔

2۔ حکمتِ منزلیہ Science of Home

ارتفاقِ ثانی کی سطح پر دوسرا شعبہ حکمتِ منزلیہ کا ہے۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"الحكمة المنزلية أن تراعي الأخلاق الفاضلة، و العلوم التّجربية، و الرّأی الكلّی فی معاملتک مع أهل منزلک و أصحابک، لتكون صحبتک علٰى أحسن وجه، و أكرم ارتباط." (12)

(حکمتِ منزلیہ یہ ہے کہ جس میں اعلیٰ اَخلاق، تجرباتی علوم اور مفادِ عامہ کی رعایت رکھتے ہوئے اپنے گھر والوں اور ساتھیوں کے ساتھ معاملات کیے جائیں، تاکہ تمھارا اپنے رُفقا کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا عمدہ طریقے سے ہو اور بہترین تعلقات پر مبنی ہو۔)

اس حکمت سے متعلق شاہ صاحبؒ نے درجِ ذیل چار بنیادی امور متعین کیے ہیں:

الف: معاہدۂ نکاح

اس کے ذیل میں شاہ صاحبؒ نے معاہدۂ نکاح اور شادی کی اہمیت اور ضرورت واضح کی ہے۔ پھر میاں بیوی کے حقوق اور ذمہ داریوں کا جامع تذکرہ کیا ہے۔ اس حوالے سے تفصیلات ''البدور البازغه'' اور ''حُجّةُ اللّٰه البالِغه'' میں بیان کی گئی ہیں۔

ب: اولاد اور ماں باپ کے باہمی حقوق

تدبیرِ منزل کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اولاد کی پرورش، تربیت عمدہ طریقے سے ہو۔ انھیں بہتر تعلیم دی جائے۔ ان کی صحت کا خاص خیال رکھا جائے۔ نیز ان میں اَخلاق کی بلندی پیدا کرنے کے لیے مناسب ماحول فراہم کیا جائے۔

اولاد پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کوششوں، مشقتوں اور تکلیفوں کا پورا خیال رکھیں، جو ان کی مناسب تربیت اور پرورش کے لیے اُن کے والدین نے برداشت کی تھیں۔ وہ ان کی عزت وتکریم سے اپنا دامن نہ بچائیں۔ ان کا کہنا مانیں۔ کبھی تلخ کلامی سے پیش نہ آئیں۔ وہی سلوک واحسان کریں، جو انھیں والدین کی جانب سے ملا تھا۔

ج: خدمت گاروں کے حقوق

اس ضمن میں حاکم اور محکوم کا باہمی تعلق بھی اہم درجہ رکھتا ہے۔ انسانی نفسیات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ رُوئے

زمین پر بسنے والے تمام انسان مزاجاً یکساں نہیں ہوتے۔ بعض طبعی طور پر قیادت کے اہل ہوتے ہیں اور حاکم بننے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں تو بعض اس سے محروم رہتے ہیں۔ تمام انسانوں کے درمیان یہ اختلاف ان کی استعداد کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ یہی وَجہ ہے کہ ہمارے مشاہدے میں روز ہی ایسے لوگ آتے ہیں جو پیدائشی طور پر روشن دماغ اور اعلیٰ فہم کے مالک ہوتے ہیں اور ایسے بھی جو کم فہم اور کُند ذہن ہوتے ہیں۔ چناں چہ ایک بہتر زندگی کی خاکہ کشی (تعمیر) کے لیے ان دونوں اقسام کا وجود لازمی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ نتیجتاً ایک کی مسرت اور راحت دوسرے کی مسرت اور راحت سے وابستہ اور اس کی رہینِ منت (احسان مند) ہے۔ چناں چہ ضروری ہے کہ دونوں اس باہمی رشتے کو مضبوطی سے قائم رکھیں۔ نیز ایک دوسرے کے رنج و غم، شادی و مسرت میں برابر کے شریک ہوں۔

د: صلہ رحمی اور رشتہ داروں کے حقوق

اس سلسلے کی چوتھی کڑی عام انسانوں کے آپس میں رہن سہن اور تعلقات سے متعلق ہے۔ بعض افراد اِتفاقی حادثات اور بیماریوں کے سبب مختلف تکالیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں ذی استعداد (قابل اور صلاحیت) لوگوں کو ان تکلیف زدہ لوگوں کی مدد کرنی چاہیے اور ان کا سہارا بننا چاہیے۔ ان کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم رکھنے چاہئیں، تاکہ یہ لوگ احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں۔ اسی طرح تمام شعبوں میں ایک دوسرے کی معاونت بھی اچھی معاشرت کا جزو ہے۔ علاوہ ازیں مشکل اوقات میں رشتے داروں کا ایک دوسرے کے کام آنا' جسے شرعی اصطلاح میں ''صلہ رحمی'' کہتے ہیں، ایک اہم اور ضروری فرض ہے۔

3۔ حکمتِ اکتسابیہ Science of Professions

ارتفاقِ ثانی کی سطح پر افراد کے پیشے اور وسائل حاصل کرنے سے متعلق علم کو شاہ صاحبؒ نے حکمتِ اکتسابیہ سے تعبیر کیا ہے۔ چناں چہ اس کی تعریف کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

''الحکمة الاکتسابية أن تراعي الرّفاهية، و الظّرافة في معاشک، فتقبل علٰى سعي تتوصّل بها بواسطة المعاملات الأُخر إلٰى جميع ما يحتاج إليه علٰى أحسن وجه و أرفع وضع.'' (13)

(حکمتِ اکتسابیہ یہ ہے کہ اپنے معاشی معاملات میں خوش حالی اور عمدگی کے پہلوؤں کی رعایت رکھی جائے۔ چناں چہ ایسی محنت اور مشقت کی جائے کہ جس سے دوسرے معاملات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی احتیاجات کے وسائل بہتر طور پر اور عمدہ طریقے سے حاصل کیے جاسکیں۔)

یہ اُس وقت پیدا ہوتی ہے، جب بعض لوگ اپنی اپنی استعداد اور حالات و اسباب کے مطابق کسی خاص پیشے میں مہارتِ تامہ پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی کپڑا بُننے کا ماہر بن جاتا ہے، کوئی اناج پیدا کرنا اپنا مخصوص پیشہ بنا لیتا ہے اور کوئی فنِ تعمیر میں کمال پیدا کر لیتا ہے۔ اس طرح انسانی معاشرے میں پیشہ وارانہ تقسیم پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وَجہ سے بعض لوگ اپنے اپنے مخصوص کاموں میں پوری پوری مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔

4۔ حکمتِ تعاملیہ Science of Trade

جب لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں تو لین دین اور خرید وفروخت کرنا، اُدھار لینے دینے، رہن وغیرہ کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ اس طرح باہمی تعاون سے طے کیے جانے والے معاملات سے حکمتِ تعاملیہ پیدا ہوتی ہے۔

5۔ حکمتِ تعاونیہ Science of Co-operation

جب انسانی اجتماع وسیع ہوجاتا ہے اور آپس میں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے تو کفالت، مشترکہ کاروبار، وکالت، مزدوروں سے کام لینے وغیرہ کے سلسلے میں حکمتِ تعاونیہ کے اصول پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں ملک اور قوم کی ترقی کے لیے تعاونِ باہمی پر مبنی انجمن سازی اور جماعتوں کی تشکیل بھی شامل ہیں۔

ان پانچوں امور پر امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''البُدورُ البازِغہ'' کی پانچ فصلوں میں بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور ان تمام کے بنیادی اساسی امور اور قواعد وضوابط کی نشان دہی کی ہے۔

ارتفاقِ دوم کی سطح پر انسانی معاشرے میں پہلے درجے کی تنظیمات (Organizations) قائم ہوتی ہیں۔ چناں چہ معاشی امور کی انجام دہی سے وابستہ افراد کی جماعتیں ہوں یا پیشوں سے وابستہ لوگوں کی انجمنیں ہوں، گھریلو اور خاندانی نظام سے وابستہ اجتماعیت ہو یا باہمی تعاون سے متعلق جماعتیں اور تنظیمیں ہوں، ان تمام کا تعلق ارتفاقِ دوم کے ساتھ ہے۔ گویا ارتفاقِ دوم کے لوازمات میں سے یہ ہے کہ لوگ کسی نہ کسی جماعت کے ساتھ وابستہ ہوکر اپنے اپنے شعبے میں مہارت اور استعداد حاصل کرتے ہوئے انسانی معاشرے کی ترقی کے لیے کردار ادا کریں۔

جب انسانی معاشروں کی انجمنیں اور جماعتیں طاقت ور اور مضبوط ہوتی ہیں تو اُن کے باہمی امور کو نمٹانے کے لیے ایک ملک میں قومی سطح پر سیاسی، معاشی نظام پر مبنی حکومتی اتھارٹی قائم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہاں سے ارتفاقِ سوم کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ ملکی سطح کے سیاسی اور معاشی امور کی چھان پھٹک کی جاتی ہے اور رائے کلی، حُبِّ جمال اور ایجادات کی روشنی میں تجربات کرکے خوب سے خوب تر ملکی نظام بنایا جاتا ہے۔

ارتفاقِ ثالث اور قومی حکومتی نظام کے بنیادی امور

ارتفاقِ ثانی کی سطح پر وجود میں آنے والی مختلف جماعتوں میں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ معاملات کا دائرہ وسیع ہوا۔ اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ان کے تعلقات و معاہدات وجود میں آئے۔ ان امور کو انجام دیتے ہوئے اختلافات بھی ہوسکتے ہیں۔ معاشرے کی اجتماعیت میں — جو دراصل صحیح اسلوب پر قائم ہے — کچھ انفرادیت پسند طبیعتوں کی وجہ سے جھگڑے پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اگر کسی سوسائٹی میں، کسی شہر میں مثلاً دس ہزار کے قریب آبادی ہوجائے اور مختلف جماعتیں وجود میں آجائیں تو وہاں لازمی طور پر ایک نظمِ مملکت اور حکومت قائم کرنے اور ایک معاہدۂ عمرانی (Social Contract) کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سیاسی ڈسپلن قائم کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

ارتفاقِ ثانی کی سطح پر قائم انھیں جماعتوں کے مجموعے سے اگلے مرحلے میں ایک ریاست کا وجود ہوتا ہے۔ جب ریاست

www.rahimia.org

وجود میں آئے گی تو اس کے لیے ایک اتھارٹی بنانی پڑتی ہے۔ قومی نظام بنایا جاتا ہے۔ اس قومی نظام کے تحت مختلف جماعتوں میں پیدا ہونے والے اختلافات کو ختم کیا جاتا ہے۔ اُن تمام معاشی سماجی امور کی انجام دہی کو حکومتی اتھارٹی کے ذریعے سے تاجروں، کاشت کاروں، صنعت کاروں اور دیگر امور سرانجام دینے والوں کو تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ غرض! معاشرے کے تمام افراد کو جان، مال، عزت آبرو کے تحفظ کے لیے ایک قومی سیاسی نظام کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہیں سے ''ارتفاقِ ثالث'' یا قومی نظامِ حکومت کا ایک ڈھانچہ سامنے آتا ہے۔

سیاسی حکومت کی ضرورت و اہمیت

شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ اس ارتفاقِ ثالث کا بنیادی مظہر ایک سیاسی نظام کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ سیاسی نظام دراصل وہ ربط (connection) ہے، جو تمام جماعتوں کے درمیان موجود ہوتا ہے، جو انھیں باہم مربوط رکھتا ہے۔ اجتماع یا ایک شہر یا ریاست کے اندر جو افراد رہتے ہیں یا وہ مختلف گھروں میں رہتے ہیں یا مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں، ان کے درمیان یہ جو ربط ہے، اس کو زیادہ سے زیادہ بہتر طور پر سرانجام دینے اور اس کو مربوط طور پر آگے بڑھانے کے لیے سیاسی نظام کی ضرورت ہے۔

شاہ صاحبؒ نے ملکی سیاست کی تعریف یہ کی ہے:

> ''و هی الحكمة الباحثة عن كيفية حفظ الرّبط الواقع بين أهل المدينة، و أعنى بالمدينة جماعة متقاربة تجرى بينهم المعاملات، و يكونون أهل منازل شتّٰى.'' (14)

> (ملکی سیاست ایک ایسی حکمتِ عملی اختیار کرنا ہے، جس میں کسی ملک میں بسنے والے لوگوں کے درمیان ملکی سطح کے روابط (معاہدۂ عمرانی) کی حفاظت (اور اس میں تغیر و تبدل) کی کیفیت سے بحث کی جاتی ہے۔ میری مراد ملک سے یہ ہے کہ اُس کے دائرۂ کار میں مختلف جماعتوں کے درمیان پیدا ہونے والے (سماجی، سیاسی اور معاشی حوالے سے) قریبی روابط اور دیگر معاملات طے ہوتے ہیں اور وہاں رہنے والے لوگ مختلف گھروں، محلوں اور شہروں میں بستے ہیں۔)

یعنی کسی ملک میں چند مختلف خاندانوں پر مشتمل لوگ اور مختلف جماعتیں ہیں، ان کے درمیان جو اُس سوسائٹی کے تقاضوں کے اعتبار سے ایک اَن دیکھا ربط ہے، اس مربوط نظام کی حفاظت سے متعلق امور پر بحث کرنا ''سیاست'' کہلاتا ہے۔ اسی طرح شاہ صاحبؒ نے شہر اور مملکت کی تعریف بھی کی ہے کہ میرے نزدیک مدینہ یا شہر سڑکوں، عمارتوں یا بلڈنگوں اور بازاروں کا نام نہیں ہے، بلکہ انسانوں کے جو انسانی رشتے ہیں، باہمی احترامات (considerations) ہیں، ان کی اجتماعیت، میرے نزدیک ''مدینہ'' (ریاست اور مملکت) ہے۔

مدینہ منورہ کا عنوان بھی مدنیت اور تمدن سے ہے۔ یثرب کو مدینہ اسی لیے کہا گیا کہ حضور ﷺ کی آمد سے پہلے وہاں کوئی شہری سول سوسائٹی نہیں تھی۔ اجتماعی طور پر کوئی مربوط نظام اور تہذیب و تمدن کی شکل موجود نہیں تھی۔ حضور ﷺ نے آ کر اُسے

www.rahimia.org

ایک تہذیب دی، ایک ریاست تشکیل دی اور اس کا ایک سیاسی نظام بنایا۔اس لیے وہ یثرب جو مختلف قبائل اور علاقوں میں منقسم مختلف چھوٹی چھوٹی جماعتوں، یہودیوں اور اوس وخزرج کے قبائل اور خود یہودیوں کے پندرہ بیس قبائل پر مشتمل تھا، اس کو ایک یونٹی (unity) دی، ایک وحدت دی، اس لیے اس کو ''مدینہ'' کہا جاتا ہے۔

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مملکت کے لیے ''مصر'' کا لفظ استعمال کیا گیا۔قرآن حکیم میں ہے کہ:

''وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ'' (15)

(اورتم کو لے آیا گاؤں سے بعد اس کے کہ جھگڑا ڈال چکا تھا شیطان مجھ میں اور میرے بھائیوں میں۔)

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین اور بھائیوں سے کہا کہ اللہ تم لوگوں کو دیہات سے یہاں مصر لایا تو ''مصریت'' بھی تمدن، تہذیب، ثقافت اور سویلائزیشن (civilization) کہلاتی ہے۔

قومی ریاست کی عصری تشکیل کے تقاضے

شاہ صاحبؒ نے چھ بنیادی اساسی امور واضح کردیے کہ قومی ریاست کی تشکیل میں کن کن امور کو پیش نظر رکھا جائے۔شاہ صاحبؒ نے ''البدور البازغۃ'' میں اس کی تفصیلات بیان کی ہیں:

1۔ جمہور کا تسلیم کردہ مسلمہ قانون اور عدالتی نظام

کسی ریاستی نظام کی تشکیل کے لیے معاہدۂ عمرانی وجود میں لایا جاتا ہے۔اس کے لیے سب سے پہلے ایک آئینی اور قانونی نظام کی ضرورت ہے۔اس حوالے سے شاہ صاحبؒ کے الفاظ ہیں:

''**لا بُدّ لهم من سنّةٍ عادلةٍ مسلّمةٍ عند جماهيرهم يفزع إليها فى فصل الخصومات.**'' (16)

(ملک میں بسنے والے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا عدل و انصاف پر مبنی جمہور کا مسلمہ قانون اور نظام قائم کریں کہ جسے لوگوں کے جھگڑے نمٹانے کے لیے پیش نظر رکھا جائے۔)

یعنی اُس ریاست میں بسنے والے جمہور لوگوں کے اتفاق سے بننے والی ''سنتِ عادلہ'' یعنی عدل و انصاف پر مبنی طریقۂ کار اور قانون وجود میں آنا چاہیے۔کوئی طبقہ، کوئی گروہ، کوئی جماعت اپنی گروہی طاقت کے بل بوتے پر اپنا خودساختہ کوئی آئین اس پر مسلط نہیں کرسکتی۔ جمہور کی رائے سے قانون وجود میں آئے۔کوئی بزنس کمیونٹی صرف اپنے مفاد کے لیے آئین اور قانون بنائے۔کوئی لینڈ لارڈ محض اپنے مفادات کا آئین اور قانون مسلط کر کے کہے کہ یہ قانون کی حکمرانی (Rule of Law) ہے، یہ درست نہیں۔لہٰذا پہلے قانون معلوم ہونا چاہیے، جس کی حکمرانی قائم کرنی ہے۔قانون اگر جاگیرداری کے مفاد کا ہے اور سرمایہ دار کے مفاد کا ہے تو پہلے تو قانون کو چیلنج کیا جائے گا کہ یہ قانون کیا جمہور کے مفاد میں ہے؟ شاہ صاحبؒ نے دوٹوک ضابطہ بتا دیا، واضح کردیا کہ کسی بھی قومی جمہوری ریاست کے لیے ضروری ہے کہ جمہور کے مفادات یا جمہور کی تسلیم شدہ (**مسلّمة عند جماهيرهم**) اساس پر قانون بنے گا۔

جو قانون جمہور کے ہاں متفق علیہ ہے، اسی قانون کی روشنی میں عدلیہ وجود میں آئے گی۔عدلیہ کا بنیادی کام اُس طے شدہ

قانون کی روشنی میں ان امور پر عمل درآمد کا جائزہ لینا ہے، جو سوسائٹی میں انجام پا رہے ہیں، خواہ جماعتوں کے درمیان ہوں یا حکمران اور عوام کے درمیان ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے عدالتی نظام کے حوالے سے چند بنیادی قواعدِ کلیہ بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم قاعدہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''أنّ القضية لا محالة إمّا ربط منزليّ أو مبادلة أو معاونة، فإذا فسد باب التفتيش و التّحقيق فالحكم فكّ الرّبط و بقاء كلّ رجل علٰى ما كان عليه. فإن كان هُناک عدوان لأحد علٰى الآخر فقدر العُدوان قدر عدل لا وكس و لا رفع.'' (17)

(عدالت میں پیش ہونے والا قضیہ اور جھگڑا یا تو گھریلو تعلقات سے متعلق ہوگا، یا خرید وفروخت سے متعلق ہوگا، یا باہمی تعاون سے متعلق ہوگا۔ ایسے معاملات میں جب تحقیق وتفتیش سے اصل صورتِ حال کا فساد معلوم نہ ہوسکے تو پھر اُس معاملے کو ختم کردیا جائے گا۔ اور ہر آدمی کو اس معاہدے سے پہلے کی حالت پر چھوڑ دیا جائے گا۔ اگر اس معاملے میں کسی نے دوسرے پر زیادتی کی ہے تو اُس کے مطابق کسی کمی زیادتی کے بغیر عدل وانصاف کے ساتھ اُس زیادتی کا بدلہ دیا جائے گا۔)

2۔ مملکت کے داخلی تحفظ کے لیے پولیس کا نظام

کسی ریاست میں بسنے والے لوگوں کی جان مال کے تحفظ کے لیے ایک ایسے ادارے کی ضرورت ہے کہ جو سوسائٹی میں فساد مچانے والوں سے لوگوں کو بچائے۔ لوگوں کو چوری، ڈاکے، قتل وغارت گری اور لوٹ مار سے بچانے کے لیے سیکیورٹی کی تمام تر ذمہ داریاں اس ادارے کے سپرد ہوں۔ اس ارتفاق کو شاہ صاحبؒ نے ''شہر یاریت'' سے تعبیر کیا ہے۔

3۔ مملکت کے خارجی تحفظ کے لیے دفاعی نظام

کسی ریاست میں بسنے والے لوگوں کو ہر طرح سے امن و امان مہیا کرنے اور ملکی دفاع کے لیے بہادر لوگوں کی فوج کی ضرورت ہوتی ہے، جو قومی سلامتی کے لیے کردار ادا کرتی ہے۔ داخلی سطح پر پیدا ہونے والی بغاوت کو دور کرنے اور دوسری ریاستوں کی طرف سے مملکت پر حملہ آور ہونے کی صورت میں مستحکم دفاع کے لیے کردار ادا کرنے والے ادارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ارتفاق کو شاہ صاحبؒ نے ''جہاد'' کے عنوان سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''إنّ اجتماع النّاس لا يخلو عن التجاوز، و التحاسد، و الشّحناء، و كثيراً ما يصحبهم الجرأة علٰى القتل و النّهب و الاجتماع، فيبغون إفساد هٰذا النّظام المنزلى، إمّا بجلب الأموال و الأراضي و الجاه، و إمّا لأحقاد دنيوية، و رفع مظالم أو حقد بسبب الدّين، فلا بُدّ من اجتماع أبطال يقاومونهم و يحفظون المدينة عن بأسهم.... هٰذا الارتفاق هو الجهاد.'' (18)

(انسانی اجتماع ایک دوسرے پر زیادتی کرنے، حسد کرنے اور بخل سے کام لینے سے خالی نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو قتل، لوٹ مار اور اجتماعیت کو نقصان پہنچانے کی جرأت کرتے ہیں۔ وہ خاندانی نظام میں فساد مچاتے ہیں۔ مال لوٹتے، زمینوں پر قبضہ کرتے اور طاقت اور قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یا کسی دُنیوی حسد اور کسی ظلم

کے خلاف عدالت میں مقدمہ کرنے یا دینی بغض اور عداوت کے سبب فساد مچاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ایسے بہادر لوگوں کا اجتماعی ادارہ بنانے کی ضرورت ہے، جو فساد مچانے والے گروہوں کا مقابلہ کریں اور مملکت کو ان کے ظلم وستم سے بچائیں۔... یہ ارتفاق ''جہاد'' کہلاتا ہے۔)

4۔ حکومتی نظم ونسق کے لیے انتظامیہ

کسی ریاست کے نظم ونسق کے لیے چوتھی چیز جو شاہ صاحبؒ نے اپنے فلسفہ ارتفاقات یا اجتماع میں بیان کی، وہ منتخب انتظامیہ ہے۔ ان کو شاہ صاحبؒ نے ''نقباء'' کہا ہے۔ اُن جماہیر کی رائے لینے والے یہ افراد سوسائٹی میں کس کردار کے اور کس شرط کے ہوں، اُن کے معیارات کیا ہونے چاہئیں؟ وہ بھی متعین ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ ہر نقیب یا منتخب نمائندے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اسی قوم میں سے ہو۔ اس کے علاوہ نہیں۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''نقيب كلّ قوم يجب أن يكون رجلاً منهم، عدلاً قيّما، عارفاً بمصالحهم و مفاسدهم، متيقّظاً لأخبارهم، و متفحّصاً عمّا يقع فيهم.'' [19]

(ہر قوم کے لیے نقیب منتخب کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ: (۱) وہ اُسی قوم کا فرد ہو۔ (۲) عدل وانصاف قائم کرنے والا ہو۔ (۳) اُن کی مصلحتوں اور اُن کو نقصان پہنچانے والے مفاسد کو جانتا ہو۔ (۴) اُن کے حالات سے باخبر ہو۔ (۵) اُن میں ہونے والے واقعات کی اچھی طرح تحقیق وتفتیش کرنے والا ہو۔)

نقبا کے مفوضہ امور بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''و من تلك الأشياء سدّ الثّغور، و إقامة الحصون، و الأسوار، و الأسواق، و بناء القناطير، و كرى الأنهار، و تزويج اليتامىٰ و حفظ أموالهم، و قسمة الصّدقات علىٰ ذوى الحاجات، و قسمة التّركات فى الورثة، و كذٰلك معرفة الرّعية، و التّقدم بجواب ما يلقىٰ إلىٰ القوم جميعا، و الجمع، و الخراج، و أمثال ذٰلك، و يسمّى بالتّولّى و بالنّقابة، و صاحبها بالمتولّى و النّقيب.'' [20]

(ان کاموں میں سے مملکت کی سرحدوں کی حفاظت، چوکیوں، قلعوں، دیواروں اور بازاروں کی تعمیر، دریاؤں پر پلوں کا بنانا، نہروں کا کھودنا، یتیموں کی شادی کرانا اور اُن کے مالوں کی حفاظت کرنا، غریب لوگوں پر صدقات وخیرات تقسیم کرنا، مرنے والوں کے متروکہ اموال کی ورثا میں صحیح تقسیم کرنا، اسی طرح عوام کی دیکھ بھال کرنا، مستقبل میں قوم کو پیش آنے والے معاملات کی پیش بندی کرنا، مال جمع کرنا اور ٹیکس وصول کرنا وغیرہ جیسے امور ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا نام نقابت اور ولایت ہے اور ان کاموں کے کرنے والوں کو متولّی اور نقیب کہا جاتا ہے۔)

5۔ تعلیم وتدریس اور تربیتی ادارے

کسی ریاست کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہاں بسنے والے لوگوں کو علم وحکمت کی تعلیم وتدریس اور تربیت دی جائے۔ چناں چہ ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں، جو سوسائٹی کی ضروریات کے مطابق تعلیم وتربیت دیں۔ اُن کے اَخلاق درست

کریں۔ اقدار و روایات کی تلقین کریں۔ اچھے اَخلاق کا درس دیں۔ گھریلو نظم و نسق اور باہمی معاملات کو خوش اُسلوبی سے سرانجام دینے کی تربیت دیں۔ وعظ و نصیحت کے ذریعے سے سوسائٹی کا مفید شہری بنانے کے لیے کردار ادا کریں۔ بد اَخلاقی کے غلط نتائج سے آگاہ کریں۔ باہمی مباحثے، مکالمے اور خطابات کے ذریعے سے لوگوں کی تربیت کی جائے۔ اس ارتفاق کا نام موعظت اور تزکیہ ہے اور اس کو سرانجام دینے والا مزکی، مرشد اور واعظ ہوتا ہے۔

ان کے فرائض اور ذمہ داریاں بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''معلّم النّاس الخير، تعليمه علٰى وجهين: أحدهما: تعليم ما يستقيم بهٖ أخلاقهم، و ينتظم بهٖ الارتفاق الثّانى و الثّالث علٰى تحرى الصّواب و إقامتهٖ. و ثانيهما: تعليم ما يستقيم به تقرّبهم إلٰى اللّٰه تعالٰى و ما ينتظم بهٖ حالهم فى الدّار الآخرة.'' (21)

(لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دینے والے معلم کی تعلیم و تربیت کے دو پہلو ہونے چاہئیں: ایک یہ کہ ایسی تعلیم دی جائے، جس سے اُن کے اَخلاق درست ہوں اور ارتفاقِ ثانی اور ثالث کا نظم و نسق بہتر طریقے سے قائم ہو۔ دوسرے یہ کہ ایسی تعلیم دی جائے، جس سے ان کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کا راستہ درست طور پر معلوم ہوجائے اور آخرت کے گھر میں اُن کی حالت درست طور پر منظّم ہوجائے۔)

6۔ حکومتی نظام اور سربراہِ مملکت

کسی ریاست کے نظم و نسق کو چلانے کے لیے ایک باقاعدہ حکومتی نظام کی ضرورت اور اہمیت ہوتی ہے۔ سربراہِ مملکت کا انتخاب اور تقرر کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ نے ایک ایسے اجتماعی نظام کی نشان دہی کی ہے کہ جس میں لوگوں کی مختلف آرا، اُن کی طبیعتوں کے تضادات اور لوگوں کے اغراض و مفادات کے درمیان آخری فیصلہ کرنے والے ایک سربراہ اور حکمران کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''و المدينة صارت بذٰلک الرّبط شيئاً واحداً، كلّ جماعة و أهل بيت منه يضاهى عضواً من أعضاء الواحد، و لها وحدة البتّة، فلا بُدّ من حفظ هٰذه الوحدة علٰى صحّتها، ثمّ تكميل منافعها، و التّدبير الّذى به توجد الصحّة، و تكمّل، و الإمام فى الحقيقة. و ليس الإمام عندنا هو الشّخص الواحد الإنسانى البتّة. نعم! إذا تولّاهُ مستعدّ لها مستبدّ بنفسه صلح الأمر كلّ الصّلاح، و يكون إماماً فى ظاهر القول.'' (22)

(مختلف جماعتوں اور لوگوں کے درمیان باہمی مربوط تعلقات کی وجہ سے کوئی مملکت ایک وحدت لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اُس ریاست کی تمام جماعتیں اور خاندان اُس ایک فرد کے اعضا ہوتے ہیں۔ یقیناً ایک مملکت وحدت لیے ہوئے ہوتی ہے۔ مملکت کی وحدت کو صحیح طور پر محفوظ رکھنے اور اُس کے تمام فوائد کی تکمیل ضروری ہوتی ہے۔ وہ نظام جس کے ذریعے سے کسی ریاست کے تمام لوگوں کی صحت مند ترقی اور فوائد کا حصول ممکن ہو، حقیقت میں ''امام'' اور حکمران ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک ''امام'' سے مراد صرف ایک انسانی فرد نہیں ہوتا۔ ہاں! البتہ کوئی بڑی وسیع استعداد

والا فرد اپنی صلاحیتوں کے سبب تمام معاملات کو درست طور پر سرانجام دے دے تو وہ ظاہری طور پر ''امام'' کہلاتا ہے۔)

شاہ صاحبؒ نے حکومتی ڈھانچے کی تشکیل کے حوالے سے ایک بڑی اہم بات 1735ء میں ''حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه'' میں لکھی ہے اور اُسی زمانے میں ''البُدورُ البازِغه'' لکھی ہے۔ روسو کا معاہدۂ عمرانی (Social Contract) تو 1762ء میں آیا ہے اور انقلابِ فرانس تو اس کے ساٹھ سال بعد آیا ہے۔ شاہ صاحبؒ اُس زمانے میں کہتے ہیں کہ ''ليس الإمام عندنا هو الشّخص الواحد الإنساني'' یعنی ہمارے نزدیک حکمران صرف ایک فردِ واحد کی آمریت یا شخصی حکومت کی بنیاد پر نہیں ہے۔

حکومتوں کے قیام کی مختلف صورتیں

شاہ صاحبؒ ریاستوں کی تشکیل کے حوالے سے دو طرح کی مملکتوں کا تذکرہ کرتے ہیں: ایک مکمل ریاستی نظام، جسے وہ ''المدينة التّامّة'' کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرا ناقص ریاستی نظام، جسے وہ ''المدينة النّاقصة'' کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں۔ مکمل ریاستی نظام چلانے کے لیے ایک ''امامُ الحق'' (مکمل نظام اور اُس کے چلانے والے سربراہِ مملکت) کی ضرورت واہمیت واضح کرتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ:

''و الرّجل الواحد المتكفّل بها جميعاً هو الإمام الحقّ، و قلّما يوجد ذٰلك، و الأكثر وقوعاً هو أن يكون القائم بأمرين أو ثلاثة رجلاً واحداً و بالباقي رجلاً آخر.'' (23)

(ملکی ریاستی نظام کا سربراہ ایک ایسا آدمی جو ریاست کے تمام امور کو اکیلا سرانجام دیتا ہے، وہ ''امامُ الحق'' ہوتا ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ دو یا تین کاموں کے لیے ایک آدمی اور باقی کاموں کے لیے دوسرا آدمی مقرر کیا جاتا ہے۔)

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء'' میں اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ ایسی کامل اور مکمل حکومت کا نظام حضور اقدسؐ سے لے کر حضرت عثمانؓ کی شہادت تک قائم رہا، جہاں ایک ''امام الحق'' نے جماعت کی متفقہ اور اجتماعی طاقت کے ذریعے ایک کامل اور مکمل مملکت کا نظم و نسق چلایا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ایک درجے میں یہ نظام جاری رہا۔ پھر ''المدينة النّاقصه'' کی صورت پیدا ہوئی۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ مختلف علاقوں میں حکومتوں کے قیام کی مختلف نوعیتیں بیان کرتے ہیں۔ اس طرح دنیا میں رائج مختلف طور طریقوں کی نشان دہی کرتے ہوئے قومی حکومتی نظم و نسق کے حوالے سے بڑی اہم بات واضح کرتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''و المُدن النّاقصة قد توجد هناك بحسب كلّ حاجة سنّة مصطلحة عليها، أو رئيس في كلّ أهل صناعة يصدرون برأيه، أو اجتماع من عقلاء القوم و مبرزيهم. و قد يكون سبب انعقاد السّنّة الإرشاد إليها من رجل مؤيّد من الغيب ثبت عندهم حقّانيته.'' (24)

(ناقص ریاستوں میں درجِ ذیل صورتیں ہوتی ہیں:

(الف) ہر ایک کام کو پورا کرنے کے لیے ایک طے شدہ طریقۂ کار مقرر کیا جاتا ہے۔

(ب) ہر ایک پیشے اور شعبے کے لوگ اپنے لیے ایک سربراہ مقرر کر کے اُس کی رائے کے مطابق کام کرتے ہیں۔

(ج) پوری قوم میں سے عقل مند اور منتخب لوگوں کا ایسا اجتماع (پارلیمنٹ) ہو، جو اُن کا نظم و نسق چلائے۔

(د) کبھی صحیح سسٹم کو قائم کرنے کے لیے ایسے آدمی (نبی اور رسول) سے رہنمائی لی جائے، جسے غیب کی تائید حاصل ہوتی ہے اور اُس کی حقانیت کو لوگ تسلیم کرتے ہیں۔)

شاہ صاحبؒ نے اس دور کے تقاضوں کے تناظر میں بڑی اہم بات کہی ہے کہ ہمارے نقطہ نظر سے ریاست کی تشکیل خاص طور پر اُن معاشروں میں، جہاں نقائص اور کمزوریاں موجود ہیں، ''**اجتماع عقلاء القوم و مبرزیھم**'' کی اساس پر ہوگی، یعنی قوم کے عقل مند اور منتخب لوگوں کا اجتماع یا پارلیمنٹ فیصلہ کرے گی۔ اس کے مطابق نظمِ مملکت چلایا جائے گا۔

واضح ہو کہ 1735ء میں جب ابھی یورپ کے ہاں جمہوریت کا کوئی تصور نہیں تھا، شاہ صاحبؒ یہ بات کہہ رہے ہیں، جو تین امور پر مشتمل ہے:

1۔ ایک یہ کہ اس اجتماع میں منتخب ہونے والا نمائندہ اسی قوم میں سے ہو۔ مولانا سندھیؒ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو آدمی قوم میں سے نہیں ہوتا، وہ قوم کی ضروریات اور تقاضوں کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ کسی دوسری قوم کا فرد آپ کی مشکلات اور مسائل کی نمائندگی کیسے کرسکتا ہے؟ قوم میں سے ہونا ضروری ہے۔

2۔ دوسرا یہ کہ وہ سمجھ دار اور عقل مند ہو۔

3۔ تیسرا یہ کہ ''مبرز'' یعنی منتخب ہو، وہ فرد جو عملی میدان میں اپنے تجربے، اپنے کردار، اپنے اعمال، اپنی عقلی، اپنی علمی و عملی خدمات کے تناظر میں یہ ثابت کرچکا ہو کہ وہ اس قوم کی نمائندگی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ گویا جاہل، بے وقوف، احمق، لاپرواہ انسان، ذاتی مفادات پر کام کرنے والا اور اجتماعیت کے لیے کوئی خدمت سرانجام نہ دینے والا آدمی منتخب نمائندہ نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ اپنی انفرادی سطح میں قوم کے لیے کوئی خدمت نہیں ادا کرسکتا تو اُس کی نمائندگی کیسے کرے گا؟

پھر جتنی جماعتیں اس سوسائٹی میں موجود ہوں، ان میں سے ان کا نمائندہ ہونا ضروری ہے۔ کسان ہیں، مزدور ہیں، زمین رکھنے والے ہیں، صنعت کار ہیں، تجارت والے ہیں، یعنی جن کی جماعت وجود میں آگئی ہو، جو قوم اپنی کمیونٹی اور اجتماعیت کی بنیاد پر ہے، ان میں سے نمائندہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ غریب عوام کا نمائندہ سرمایہ دار ہے، تاجر ہے، جس نے اپنا مال بیچنا ہے۔ یہ نہیں کہ مزدور اور کسان کا نمائندہ لینڈ لارڈ اور فیوڈل لارڈ ہو جو اپنے مفادات کے لیے نمائندگی کرتا ہے۔ بلکہ سوسائٹی میں جتنی موجود جماعتیں ہیں، ان کی نمائندگی اسی تناسب سے اس اجتماع کے اندر ہوگی۔

قومی قیادت کی نوعیت

ظاہر ہے کہ ہر اجتماع کا ایک سربراہ ضروری ہے۔ شاہ صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ:

''**و کلّ نظام فلا بدّ فیه من سائس.**'' (25)

(ہر ایک نظام کے لیے ضروری ہے کہ اُس کا ایک سیاست کرنے والا سربراہ ہو۔)

ہر نظام کا ایک رہنما اور لیڈر ہوتا ہے۔ مملکت کے نظم و نسق کے لیے بھی ایک ''سائس'' و منتظم اور قائد چاہیے، فیصلہ کرنے والا

www.rahimia.org

ہونا چاہیے، جو ملکی فیصلوں کو اجتماعی شکل دے کر اس پر عمل درآمد کرائے۔

قرآن حکیم نے طالوت کو بادشاہ مقرر کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے اُس کی قیادت کی یہ خصوصیات بیان کی ہیں:

''زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ط'' (26)

(زیادہ فراخی دی اس کو علم میں اور جسم میں)

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ کسی ریاست کے قائد اور سربراہِ مملکت کے لیے یہ ضروری ہے کہ:

(الف) وہ علم بھی اعلیٰ درجے کا رکھتا ہو۔ وہ دنیا کے تمام سیاسی، سماجی، معاشی، عمرانی، تمام معاملات کا فہم رکھتا ہو۔ اس کا علم وسیع ہو اور وہ باقی تمام لوگوں سے علم میں، تجربے میں، مشاہدے میں سب سے بہتر ہو۔

(ب) وہ آزاد ہو، کسی دوسرے کی ڈکٹیشن قبول کرنے والا نہ ہو، دوسرے ملکوں یا دوسرے حکمرانوں کی ڈکٹیشن کی اساس پر اس کے فیصلے نہ ہوں بلکہ آزادیٔ رائے اور حریت کے ساتھ فیصلہ کرے۔

(ج) بہادر اور دلیر ہو، یعنی اُس میں اعلیٰ درجے کی شجاعت ہو اور بزدل نہ ہو۔ بزدل کے حوالے سے ایک دلچسپ جملہ شاہ صاحبؒ نے استعمال کیا ہے: ''كادت الشّاة تبول عليه.'' (27) (بکری بھی اس پر پیشاب کر جائے گی) گویا بزدل آدمی کی کیا حیثیت؟ وہ حکمرانی کے لائق کیسے ہوسکتا ہے؟

(د) شاہ صاحبؒ نے خصوصیت کے ساتھ ''البدور البازغه'' میں لکھا ہے کہ اَخلاقِ فاضلہ مملکت کے سربراہ کے لیے لازمی اور ضروری ہیں۔ اسی طرح انتظامیہ کا سربراہ، اجتماع اور اس پارلیمنٹ کا سربراہ، اس کے وزرا عمدہ اَخلاق رکھتے ہوں۔

پھر شاہ صاحبؒ نے لازمی قرار دیا ہے کہ عدلیہ، انتظامیہ اور آئین و قانون کے تین دائروں کے بعد اگلے مرحلے میں سوسائٹی میں امن و امان قائم کرنا اس قومی نظام کی ضرورت ہوگی۔ اور اس کے لیے داخلی سیکیورٹی فورسز، یعنی پولیس یا وزارتِ داخلہ کے نظم ونسق کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طریقے سے دوسرے ملکوں سے تحفظ کے لیے فوجی طاقت اور قوت یا عسکری سپہ سالار کا ہونا بھی ضروری ہے۔ پھر جن بنیادی امور کو ایک قومی ریاست کی تشکیل کے لیے لازمی قرار دیا، ان میں سے ہر ایک کے معیارات بتلائے کہ سپہ سالار کی کیا خصوصیات اور تقاضے ہوں؟ ملک کے داخلی نظم ونسق میں امن و امان کو یقینی بنانے والی سیکیورٹی فورسز کے بنیادی اساسی امور کیا ہوں؟ انتظامیہ کے معیارات کیا ہوں؟ منتخب نمائندوں کے کیا معیارات ہوں؟ آئین اور قانون کی تشکیل کی بنیادی اساسیات کیا ہوں؟

شاہ صاحبؒ کے ہاں قانون ساز جماعت کو سوسائٹی کے مصالح و مفاسد معلوم ہونے چاہئیں اور اس کی بنیاد پر وہ علم التّشریع کے بنیادی اساسی اصولوں سے واقف ہو۔ قانون سازی ایک مستقل عمل ہے اس لئے سماجی لہروں کو سمجھنا اور اُن سماجی لہروں کے تناظر میں انسانی مسائل کا ادراک کر کے اُن کو حل کرنے کی بروقت قانون سازی کرنا ضروری ہے کہ اجتماع اس کے بغیر ترقی نہیں کر سکتے۔

پھر ایک اَور اہم ترین شعبہ شاہ صاحبؒ نے قومی ریاست کے لیے بیان کیا ہے کہ اُس سوسائٹی کو ہموار طریقے سے آگے بڑھانے کے لیے تعلیم وتربیت کا نظم ونسق قائم کرنا ضروری ہے۔ کوئی سوسائٹی اس وقت تک ترقی نہیں کرتی، جب تک کہ علم وشعور

www.rahimia.org

پھیلانے والی دانش گاہیں موجود نہ ہوں۔ ایسے تعلیمی ادارے موجود نہ ہوں، جو ان تمام امور کی تربیت دیں کہ تجارت اعلیٰ درجے پر کیسے کرنی ہے؟ عمارتیں اور بلڈنگیں کس طریقے سے بنانی ہیں؟ انسانی صحت کے علاج کے لیے ڈاکٹر اور طبیب کیسے تیار کرنے ہیں؟ اُن کے معیارات کیا ہوں گے؟ اسی طریقے سے مسلمان معاشرہ ہے تو وہاں دین کے پڑھنے پڑھانے کا علمی منہج بھی واضح ہونا چاہیے (اس علمی منہج کی تفصیلی گفتگو علم اسرارِ دین کے تناظر میں ہوچکی ہے)۔ شاہ صاحبؒ کے نظریات اور افکار، دوٹوک علمی تشریح کرتے ہیں اور علمی منہج واضح کرتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک ہر معاشرے میں یہ چھ بنیادی امور یا وزارتیں اور ان کے ذمہ دار افراد کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ یعنی تعلیم، داخلی سلامتی، سرحدوں کا تحفظ، قانون سازی، انتظامیہ اور عدلیہ کا پورا نظام ضروری ہے۔ شاہ صاحبؒ نے واضح کیا کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں کسی بھی اجتماع کو ان شعبوں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں، بلکہ جیسے جیسے سوسائٹی کا ارتقا ہوتا ہے، ضرورتیں ہوتی ہیں، وزارتیں اور ڈویژن بڑھتے رہتے ہیں، اُن میں ترمیم و تنسیخ بھی ہوتی رہتی ہے۔ یہ تو صرف اصولی قواعد وضوابط کی بات ہو رہی ہے۔ یہاں لازمی اور ضروری امور ذکر کیے گئے ہے۔ اس سے ارتفاقِ ثالث یا قومی سطح کا معاہدۂ عمرانی اپنی ایک شناخت پیدا کرتا ہے۔ اس سے قوم ترقی کرتی ہے اور پوری اجتماعیت ہموار طریقے سے آگے بڑھتی ہے۔

ارتفاقِ رابع یا بین الاقوامی نظام

اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اس طرح ریاستیں اور ممالک یا قومی ریاستیں اور ڈھانچے کھڑے ہو جائیں اور ممالک بن جائیں تو پھر ایک ضرورت پیش آتی ہے کہ ملکوں کے درمیان بھی ایک بین الاقوامی نظام ہونا چاہیے۔ انسانی فائدے یا انسانی اجتماعیت کا یہ چوتھا مرحلہ ہے، جس کو ''ارتفاقِ رابع'' کہا گیا۔ اس لیے کہ ملکوں کے درمیان بھی جھگڑے ہو سکتے ہیں۔ کوئی طاقت ور ملک کسی چھوٹے ملک کو ہڑپ کرسکتا ہے، امن و امان کو تباہ کرسکتا ہے، معاشی بدحالی میں مبتلا کرسکتا ہے، ان کی منڈیوں پر قبضہ کرسکتا ہے اور ان پر ظلم و ستم مسلط کرسکتا ہے۔ ایسی صورت میں ضرورت پیش آتی ہے کہ یہ ممالک مل کر ایک بین الاقوامی ڈھانچہ قائم کریں۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک ارتفاقِ رابع یا بین الاقوامی نظام یہ ہے کہ ممالک کے درمیان جو باہمی تعلقات یا ربط موجود ہے، وہ انسانی بنیادوں پر قائم ہونے چاہئیں۔ یعنی انسانی اجتماعیت کے تناظر میں اُن بین الاقوامی روابط کی حفاظت کرنا، ہر قوم کے حقوق کا تحفظ کرنا، مذکورہ چھ امور میں ان کی معاونت اور اس کو زیادہ بہتر سے بہتر کرنا اور اس کے لیے بہتر اقدامات کرنا۔

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بین الاقوامی قانون تمام ملکوں اور ریاستوں کا تسلیم شدہ ہو۔ یہ تسلیم کرنا کسی جبر سے نہ ہو، بلکہ ان کے جمہور کی اساس پر منتخب نمائندوں اور اُن کے ممالک کی آزاد مرضی سے وجود میں آئے۔ گویا آج کی طرح صرف پانچ ویٹو پاور رکھنے والے ممالک (امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اور چین) اپنا بنایا ہوا قانون اور ضابطہ دنیا کے ایک سو بانوے ملکوں پر مسلط نہ کریں۔ یہ بین الاقوامی قانون اور ضابطہ نہیں ہے۔ تعلقاتِ اقوام کی یہ بنیاد نہیں ہے۔ انسانیت کی ترقی کے بین الاقوامی قانون پر عمل درآمد کے لیے ایک اتھارٹی کی ضرورت ہے۔ اس اتھارٹی کے ٹائٹل کے لیے شاہ

www.rahimia.org

صاحبؒ نے ''خلیفہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یعنی وہ، تمام انسانوں کے لیے، جن کو اللہ تعالیٰ نے ''جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً'' (28) قرار دے کر بھیجا ہے، بلاتفریق رنگ، نسل و مذہب، اللہ کا نائب بن کر کل انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے۔

خلافت دراصل وہ بین الاقوامی نظام ہے، جو ممالک کے باہمی تعلقات اور ان کو عدل و انصاف پر قائم کرنے کے لیے کردار ادا کرے۔ اس کا تعلق انسانی مسائل کے حل سے ہے۔ امن و امان کو یقینی بنانے سے ہے۔ بلاتفریق رنگ، نسل و مذہب معاشی خوش حالی اور ترقی سے ہے۔ انسانی اصولوں کی خلافت اور حکومت ہے۔ انسانی اصولوں کی ترقی کے لیے کردار ادا کرنا اور بہتر طریقے سے ایک بین الاقوامی فورس اور قانون بنانا ہے۔ تمام انسانوں کی مجموعی ترقی کا تعلیمی نظام بنانا ہے۔ عالمی عدالتِ انصاف بنانا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بین الاقوامی سطح پر عدل، امن اور معاشی خوش حالی قائم کرنا اور اس کو یقینی بنانا اس خلافت کا کام ہے۔ یہ بین الاقوامی نظام ہے، اس کے لیے ایک بین الاقوامی طاقت کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ اتھارٹی تمام انسانوں کو انصاف فراہم کرے۔

یہ چار بنیادی ارتفاقات اور ان کے مراحل، اور اجتماعی تشکیل کے حوالے سے ان کے اصولِ کلیہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک ایسے اصولِ مسلمہ ہیں کہ یہودیت ہو، عیسائیت ہو، ہندومت ہو، یا دنیا کا کوئی مذہب اور فرقہ ہو، یا اسلام کی تعلیمات ہوں، تمام کے ہاں عقلی، نقلی اور کشفی طور پر ثابت شدہ اور مسلمہ ہیں۔ کسی کو اس سے اختلاف نہیں ہوگا۔ اس سے اختلاف کرنے والے ممکنہ طور پر دو طبقے ہوسکتے ہیں: ایک بالکل بے وقوف، جو جانوروں کی طرح ہوتے ہیں۔ دوسرے مجنون اور پاگل یا شر پسند طبیعتیں جو کسی بھی سطح کے کسی قانون کو نہیں مانتیں۔ ورنہ دنیا کی مہذب انسانیت، تمام مذاہب اور ملتیں، تمام سکول آف تھاٹ (schools of thought) اس کو بنیادی طور پر تسلیم کرتے ہیں۔

دورِ زوال میں حکمتِ عملی

شاہ صاحبؒ نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ سوسائٹی کی ضرورت تو یہ ہے کہ یہ چاروں ارتفاقات سوسائٹی کی کل انسانیت کی شیرازہ بندی کے لیے کردار ادا کریں لیکن اگر انسانیت پر زوال آجائے، اجتماعی نظام میں کمزوری پیدا ہوجائے اور کسی مرحلے پر ''ارتفاقِ رابع'' ٹوٹ جائے، لوگوں کے درمیان لڑائی اور فساد پیدا ہوجائے تو پھر بہت لازمی اور ضروری ہے کہ ہر قوم اپنا قومی ارتفاق یا قومی جمہوری نظام اور اپنا ریاستی ڈھانچہ محفوظ کرنے کی فکر کرے۔ اقوامِ عالم کی فکر سے واپس لوٹ کر اپنے قومی ارتفاق، اپنے ریاستی ڈھانچے اور اپنی جغرافیائی حدود کے بنیادی تقاضوں کو ان اصولوں پر قائم رکھنے کے لیے کردار ادا کیا جائے۔ یہ بڑی اہم ترین حکمتِ عملی ہے کہ اگر کل انسانیت کے مفاد کا بین الاقوامی نظام باقی نہیں رہا تو قومی ریاستی نظام کو اس کی اساس پر بنایا جانا ضروری ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اگر بالفرض کوئی قومی ریاست ان اصولوں پر قائم نہیں ہے، وہ بھی ٹوٹ رہی ہے اور بکھر رہی ہے اور وہاں بھی مفاد پرست طبقہ غالب آرہا ہے تو پھر کم از کم ''ارتفاقِ ثانی'' کی سطح کے عقل مند، باشعور لوگ، اپنی ایک اجتماعیت قائم کریں۔ اپنی جماعت بنائیں، ان اصولوں کے فروغ اور پھیلاؤ اور ان کو قائم کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کریں۔ اس کے لیے عملی جدوجہد اور کوشش کریں۔ ایسا نہیں کہ سوسائٹی کو تباہی اور بربادی کے دہانے پر جانے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ اگر ارتفاقِ ثانی بھی

ٹوٹ گیا تو یہ انسانیت کی تباہی ہے کہ ان اجتماعی اصولوں پر دعوت دینے، محنت کرنے، جدوجہد اور کوشش کرنے والی کوئی جماعت بھی نہیں رہی تو انسانی تباہی کا راستہ کھل گیا۔

ارتفاقات کی انسانی زندگی میں اہمیت

شاہ صاحبؒ نے ''حُجَّةُ اللّٰهِ البالِغه'' میں ایک بڑی اہم بات یہ بھی کہی کہ:

''إعلم أنّ الرّسوم من الارتفاقات، هی بمنزلة القلب من جسد الإنسان.'' (29)

(جاننا چاہیے کہ (انسانی زندگی کی سہولتوں پر مبنی) ارتفاقات میں رسومات' یعنی طور طریقوں کے نظام کی وہی حیثیت ہے، جو انسان کے جسم میں دل کی حیثیت ہے۔)

ارتفاقات کے اصول یا بنیادی امور اور ان کے قوانین اور ضابطوں کی اہمیت ایسی ہے جیسے انسانی جسم میں دل کی، کہ دل کام کرنا چھوڑ جائے تو انسان ختم ہوجاتا ہے۔ ارتفاقات درست طور پر قائم نہ ہوں تو معاشرہ تباہ ہوجاتا ہے۔ اجتماعیت کے یہ اصول بروئے کار نہ لائے جائیں تو معاشرے کی موت ہے۔

شاہ صاحبؒ مزید کہتے ہیں کہ:

''و إيّاها قصدت الشّرائع اوّلاً و بالذّات.'' (30)

(تمام ملتوں کی شریعتوں (دساتیر) میں براہِ راست یہی طور طریقے اور نظامِ ارتفاقات پہلی حیثیت رکھتے ہوئے بنیادی طور پر مقصود ہوتے ہیں۔)

یعنی تمام شریعتوں میں اور بالخصوص شریعتِ محمدیہ میں اوّلاً و بالذات (essentially and directly) اجتماعیت پر مبنی یہ ارتفاقات اور امور پہلا ہدف ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ:

''و عنها البحث فی النّواميس الإلٰهية و إليها الإشارات.'' (31)

(الٰہی نوشتوں میں بھی انھیں امور سے بحث کی جاتی ہے اور انھی کی طرف اشارات کیے جاتے ہیں۔)

یہی ارتفاقات ہیں کہ نوامیسِ الٰہیہ میں جن کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی مقدس نوشتے؛ تورات، زبور، انجیل اور خود قرآن حکیم میں انھیں امور کو روبہ عمل لانے کے بنیادی اشارات اور رہنمائی فراہم کی گئی ہے۔ اور اسی کے لیے انبیا علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے۔

آج بڑی عجیب بات ہے کہ مذہب کے نمائندوں کے ہاں عقائد تو بجا طور پر اہمیت رکھتے ہیں، لیکن عقائد کے تناظر میں ارتفاقات کی اہمیت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ان کے ہاں عبادات کی اہمیت پر گفتگو کی جاتی ہے، لیکن ارتفاقات یا اجتماعی تقاضوں کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ:

''سارے لوگ میری عبادت کریں تو میری خدائی میں کوئی اضافہ نہیں۔ اور سارے لوگ میرا انکار کردیں، کفر کریں، عبادتیں چھوڑ دیں تو میری خدائی میں کوئی کمی نہیں۔'' (32)

دین اسلام کی عبادات اور عقائد بھی انسانی فلاح و بہبود کے لیے ہیں۔ جیسا کہ تفصیل سے علم اسرارِ دین کے حوالے سے گزشتہ لیکچر میں گفتگو ہوچکی ہے۔ ان کا ہدف بھی دراصل انسانی اجتماعیت ہے، یعنی اس کرۂ ارض پر رہنے والے انسانوں کے اجتماعی تقاضوں کی تہذیب اور ترتیب قائم ہو۔ تا کہ اللہ سے تعلق اور خدا پرستی کا لازمی نتیجہ انسان دوست اجتماعیت کی صورت میں ظاہر ہو۔ شاہ صاحبؒ کی اس گفتگو سے واضح ہوا کہ تمام شریعتوں کا بنیادی، پہلا اور ذاتی مقصد یہی ارتفاقات کے طریقے ہیں کہ اجتماعیت کے ان اصولوں کو بروئے کار لایا جائے۔

سماجی تشکیل کے دو منہج اور طریقے

ان اصولی امور اور ان مسلمہ قاعدوں کی روشنی میں ریاستوں کے قومی اور بین الاقوامی نظام قائم کرنے کے دو منہج اور طریقہ ہائے کار امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ بتلاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ''علم اسرارِ دین'' کے موضوع پر اپنے لیکچر میں ''سیاستِ ملیہ'' کی بحث میں ملتوں کی تشکیل کے دو طریقے واضح کیے تھے۔ وہ دو منہج درجِ ذیل ہیں:

(۱) ایک طریقہ حکما کا ہے کہ جن قوموں کے نزدیک جو کوئی عقل مند حکیم ہیں، بہترین سائنس دان یا کوئی نئی ایجادات اور دریافت کرنے والا ہے، خواہ نظریات کے حوالے سے ہو، ٹیکنالوجی کے حوالے سے ہو، اجتماعی تقاضوں کے حوالے سے ہو، تو وہ قومیں ایسے حکما کے طے کردہ اصولوں پر نظام بناتی ہیں۔ جیسے آج یورپ کا نظام قائم ہے۔ انھوں نے جس حکیم اور مفکر کو، مثلاً روسو، ڈارون، فیورباخ اور ایڈم سمتھ کو مانا یا دوسری طرف ہیگل اور کارل مارکس کے فکر کو تسلیم کیا، تو ان حکما اور مفکرین کے دریافت کردہ نظریات اور خیالات کے تناظر میں انھوں نے اپنا نظام بنایا۔

(۲) دوسرا طریقہ انبیا علیہم السلام کا ہے کہ انھوں نے انسانی معاشرے کی تشکیل کے طریقے، نظام اور اصول طے کیے ہیں۔ اُن کے مطابق عملی نظام بنایا جائے۔ بالخصوص اس آخری دور میں امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طے کردہ طریقوں اور اصولوں کے مطابق قومی ریاستوں اور بین الاقوامی نظام کی تشکیل کا عمل ہے۔

یہ دو دائرے ہیں۔ دونوں دائروں کا سمجھنا اپنی جگہ پر ضروری ہے۔ وہ معاشرہ یک طرفہ ہوگا جو صرف انسانی جسم کے تقاضوں کی تکمیل کے تناظر میں نظام بنائے گا۔ چناں چہ عام طور پر حکما، خاص طور پر مادی فلسفے کو سامنے رکھنے والے لوگ (جس پر پرسوں ہم نے گفتگو کی تھی) محض مادی نقطہ نظر سے معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔ جنھیں عقل کی بنیاد پر ''مشائین'' کہا جاتا ہے۔ انبیاؑ کی تعلیمات کی حقیقت انسانی روح اور انسانی جسم کی جبلت یعنی بہیمیت اور مَلَکیت کے تناظر میں ہے، یعنی ایسا اجتماعی نظام ہو، جس میں اس کی روح بھی ترقی کرے اور اس کے جسم کے ارتفاقات اور ضرورتیں بھی ترقی کرتی رہیں۔ انسانی سماج کے ارتفاقات کا یہ جامع تصور انبیا علیہم السلام نے دیا۔

شاہ صاحبؒ نے ''**حجّة اللّٰه البالغه**'' میں تو چند اشارات کیے ہیں مگر اس کو پوری تفصیل کے ساتھ ''**البدور البازغه**'' کے آخری مقالے میں بیان کیا ہے کہ ملتیں کیسے بنتی ہیں، ان کی اساس پر ارتفاقات کا نظام کیسے وجود میں آتا ہے، ملتِ مجوس نے کیسے بنایا، ستارہ پرست (**نجّامین** یعنی نجومیوں) نے کیسے بنایا، مادہ پرست (**طبیعیین** کی) ملت کیسے وجود میں آئی اور ملتِ

ابراہیمیہ حنیفیہ کیسے وجود میں آئی اور اس کے ارتقا کے مراحل کیا ہیں؟ اور ملتِ ابراہیمیہ حنیفیہ کا آخری اور جامع ایڈیشن امام الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا پیش کیا؟

سماج کے لیے تباہ کن نظام کے مضمرات

ایک بات طے شدہ ہے کہ حکما کے طریقے پر سوسائٹی کی تشکیل ہو، یا انبیؑا کے طریقے پر سوسائٹی کی اجتماعی تشکیل ہو، اگر سوسائٹی کے اس نظام کو چلانے والے اور اس اجتماع کو قائم کرنے والے حکمران طبقے انفرادی اور طبقاتی مفادات کی بنیاد پر کسی ریاست کا قومی نظام یا بین الاقوامی نظام تشکیل دیں گے تو یہ تباہی کا راستہ ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ حکما کی دریافت کردہ حکمتیں ہوں یا انبیا کے دریافت کردہ سنن اور طریقے ہوں، اپنے اصل قانون کے اعتبار سے درست ہوتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ معاشروں پر ایسے لوگ قومی سطح پر یا بین الاقوامی سطح پر سیاست پر قابض اور حکمران طبقے کی صورت اختیار کر جاتے ہیں کہ جن کے مفادات جزوی ہیں۔ وہ اپنے گروہ، اپنی نسل، اپنے طبقے کے اسیر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اقبال نے یورپ کے بارے میں کہا کہ ؎

اگر قبول کرے ، دینِ مصطفیٰ ، انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

نسل کی بنیاد پر جو سماجی تشکیل کا عمل ہے کہ یہ نسل اعلیٰ (superior) ہے۔ یہ بزنس کلاس اونچی ہے، یہ لینڈ لارڈز بالاتر ہیں، یہ شاہ صاحبؒ کی اصطلاح میں ''رأی جزئی'' (انفرادیت پسندی پر مبنی رائے) کہلاتی ہے۔

انفرادیت پسند حکمرانوں کے رویوں کا تجزیہ

شاہ صاحبؒ ''حجة اللّٰه البالغه'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب ''رأیِ جزئی'' والے طبقے حکمران بنتے ہیں تو وہ انسانی سماج میں درجِ ذیل منفی رویوں کے حامل ہوتے ہیں:

(الف) نقصان پہنچانے والے پیشے (اکسابِ ضارّة) اختیار کرتے ہیں۔

(ب) درندوں والے اعمال، شیر جیسے پھاڑنے چیرنے والے اعمال (اعمالِ سبعية) کرتے ہیں۔

(ج) ظالمانہ ٹیکس لگاتے ہیں اور رعایا کا استیصال (جبايات منهكة، و خراج مستأصل) کرتے ہیں۔

حال آں کہ سیاست اور حکومت تو اس لیے تھی کہ لوگوں کی تمام جماعتوں میں امن، جان، مال، عزت و آبرو کا تحفظ اور ان کے پیشوں کو ترقی یافتہ بنانے اور فروغ دینے کے لیے کردار ادا کیا جاتا، مگر اُن کا معاملہ اُلٹا ہو جاتا ہے۔ چناں چہ محنت کش تاجروں سے مال سمیٹ کر ایک مخصوص حکمران طبقے کی کمپنیوں اور ان کے مفادات کے لیے کام کیا جاتا ہے۔ ظالمانہ ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ آزادی اور حریت کے قومی تقاضوں کے مطابق فیصلے کرنے کے بجائے غیرملکی طاقتوں کی ڈکٹیشن پر نظام بنایا جاتا ہے وغیرہ۔

جب ایسے انفرادیت پسند طبقاتی سوچ رکھنے والے یا نسل پرست اور ایک مخصوص جماعت کی نمائندگی کرنے والے بزنس مین یا لینڈ لارڈ کسی سوسائٹی پر مسلط ہوتے ہیں تو وہاں طریقۂ حکما کا عنوان اختیار کیا جائے، وہ بھی فیل ہو جاتا ہے یا طریقۂ انبیا کا نام لیا جائے، وہ بھی فیل ہو جاتا ہے۔ دونوں کے نتائج منفی نکلتے ہیں۔

www.rahimia.org

شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ حکمران طبقہ جو شروع میں ظلم کی طاقت کے بل بوتے پر آتا ہے تو اس کے نتیجے میں کوئی آدمی ان کے سامنے بولتا نہیں۔ لوگ جبر اور قہر کی وجہ سے اُن کے تابع رہتے ہیں اور پھر سوسائٹی کے جو مفاد پرست طبقات بڑے بڑے حکمرانوں کے خوشامدی، اُن کا تھیلا اٹھانے والے، ان کے مدد و معاون بن جاتے ہیں۔ اس طرح مافیاز (mafias) وجود میں آجاتے ہیں۔ جو تاجر چھوٹا ہوتا ہے، وہ بڑے بزنس مین کا چیلا ہوتا ہے۔ چھوٹا کاشت کار بڑے فیوڈل لارڈ کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ فرد ایک چھوٹے شعبے سے تعلق رکھتا ہے، لیکن وہ بڑی چھلانگیں لگا کر، بڑے لوگوں کے ساتھ تعلقات پیدا کر کے مارکیٹ پر اپنی دہشت پیدا کرتا ہے۔ یہ بہت بڑی خرابی ہے۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ظلم و ستم کا نظام مستحکم ہوتا جاتا ہے۔

جو اُس قوم کے انصاف پسند طبقات ہوتے ہیں، وہ شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں ''اُخریات القوم''، یعنی پچھلی صفوں اور بنچوں پر بٹھا دیے جاتے ہیں۔ غصے سے خاموش رہتے ہیں ۔ خواہش ضرور رکھتے ہیں کہ سسٹم بدلے، لیکن جبر و قہر کے عالم میں وہ غصے سے زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں یا گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو کچھ ''نیک'' لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ سیاست ہی بُری ہے، یہ اتفاقات اور معیشت کی بحث ہی بُری ہے۔ بس نمازیں پڑھو، روزے رکھو، تسبیحات گھماؤ۔ دنیا ٹھیک نہیں ہوسکتی۔ یوں مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے یہ منظر نامہ اپنے دور کی سوسائٹی کا بیان کیا ہے اور انھیں قیصر و کسریٰ کے مشابہ قرار دیا ہے۔ جس کی تفصیلات پچھلے لیکچرز میں جابجا بیان کی جاتی رہیں، اس حوالے سے شاہ صاحبؒ کا یہ تاریخی جملہ ہے کہ:

''و ما تراه من ملوک بلادک یغنیک عن حکایاتهم.''

(یعنی عصر حاضر کے ملوک و سلاطین اور والیانِ ریاست کی عیاشیوں کو دیکھ کر تم ان (قیصر و کسریٰ) کی عیاشیوں اور زندگی کی لذات میں حد سے بڑھنے کا اندازہ لگا سکتے ہو۔) (33)

تیرے گرد و پیش کے حکمرانوں کے کرتوت، تمھیں قیصر و کسریٰ کے حالات یا پچھلے ظلم کی کہانیاں بھلا دیں گے۔ آج گرد و پیش میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے زمانے میں کیا! بلکہ برصغیر پاک و ہند کی غلامی کے اس دو سو سال میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔

سماجی تبدیلی کی ذمہ داری

اس موقع پر فریضہ کیا ہے؟ شاہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا:

''یجب بذل الجُهد علیٰ أهل الآراء الکُلّیة فی إشاعة الحقّ و تمشیته، و إخمال الباطل و صدّه، فرُبما لم یُمکن ذٰلک إلاَّ بمخاصمات، أو مقاتلات، فیُعدّ کُلّ ذٰلک من أفضل أعمال البرّ.'' (34)

(اجتماعی مفاد کی سوچ رکھنے والے لوگوں پر لازم ہوجاتا ہے کہ وہ سچی اور حق بات کی اشاعت اور اس کے پھیلاؤ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اور باطل نظام کو ختم کرنے اور اس کا راستہ روکنے کے لیے کردار ادا کریں۔ بعض اوقات یہ کام مفاد پرست حکمرانوں سے مزاحمت اور لڑائی کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے موقع پر اس طرح کی (انقلابی) جدوجہد

www.rahimia.org

پر مبنی کام کرنا، نیکی کے تمام کاموں میں سے سب سے زیادہ افضل عمل ہوتا ہے۔)

وہ لوگ جو مفادِ عامہ اور رائی کلی کی سوچ رکھتے ہیں، ان پر واجب اور فرض ہے کہ وہ اپنی جدوجہد کے تمام ذرائع و وسائل خرچ کریں۔ اجتماعیت کے بنیادی علم کے فروغ اور اس حق کے امر کو غالب کرنے کی شعوری جدوجہد اور کوشش جاری رکھیں۔ اگر وہ بھی مایوس ہو کر بیٹھ گئے تو پھر انسانیت کی تباہی و بربادی کا راستہ کون روکے گا؟ ان کے لیے لازمی ہے کہ وہ اجتماعیت کے علم کی اشاعت کریں، اسے فروغ دیں اور اس کے پھیلاؤ کے لیے کام کریں، حق بات کو لوگوں کے سامنے بیان کریں۔ اور جو باطل طور طریقے اجتماعیت کی تباہی اور بربادی کے ہیں، ان کو اپنے علم وشعور کی بنیاد پر واضح کریں کہ یہ اجتماعیت کا نقصان ہے، یہ انسانی مفاد کے خلاف بات ہے اور باطل کا راستہ روکیں۔ اور اس راستہ روکنے کے دو طریقے بھی شاہ صاحبؒ نے بیان کیے:

''رُبما لم يمكن الا بمخاصمات أو بمقاتلات.''

(الف) ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ دوسروں سے مباحثہ، مکالمہ، مخاصمہ، برابر کی سطح پر اُن سے بات چیت اور گفتگو کریں، اُن سے عمدہ طریقے سے مجادلہ کریں، دلائل اور منطق (logic) سے ثابت کریں۔ یہاں تشدد کے راستے کی بات نہیں ہو رہی۔ یہاں تک کہ ''رأیِ کُلّی'' اور مفادِ عامہ کا عملی کردار ادا کرنے والوں کی ایک منظّم قانونی طاقت بن جائے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں تیرہ سال کی محنتوں کے نتیجے میں ایک جماعت وجود میں لائے۔

(ب) دوسرا یہ کہ قومی نظام کے قیام کے بعد اگلا مرحلہ ''مقاتلات'' (لڑائی اور جہاد) کا بھی آ سکتا ہے۔ مگر پہلے مرحلے میں تو اپنے اوپر، اپنی ذات پر، اپنی سوسائٹی میں، اپنی اجتماعیت میں، اپنی شیرازہ بندی میں، مباحثے اور مکالمے کے ذریعے سے ان اجتماعی اصولوں کے علم وشعور کے فروغ کا عمل واجب ہے۔

شاہ صاحبؒ کے ہاں یہ کام کرنا فرض نماز اور دیگر بنیادی فرائض جو اللہ نے مقرر کیے ہیں، ان کو ادا کرنے کے بعد دنیا کا افضل ترین عمل ہے۔ تمام نوافل، مستحبات، وظائف اور مسنونات میں سے سب سے افضل ترین عمل (افضل أعمال البرّ) اُس زمانے میں یہی جدوجہد اور کوشش یعنی اس علم کی شمع کو روشن کرنا اور اس اجتماعیت کا شعور حقائق اور دلائل کے تناظر میں پھیلانا ہے۔ یاد رہے کہ سوسائٹی میں ''آرائے جزئیہ'' کے ماننے والے (جیسے ابھی مفتی سعید الرحمٰن صاحب نے بھی اُن کا ذکر کیا ہے) تحریک پر تحریک چلاتے ہیں، لیکن اس تحریک کے پیچھے جو علم ہے، شعور ہے، منظّم اجتماعیت، منظّم جدوجہد، مکالمے اور مباحثے کا انداز اور اُسلوب ہے، وہ تو موجود نہیں ہے۔ صرف تشدد اور انتہا پسندی کی بنیاد پر لڑائی بھڑائی کا عمل، قتل و غارت گری ہے۔ دنیا میں اس طرح سے تو معاشرے نہیں بدلتے۔

آج کے دور کا تقاضا

جن جن معاشروں میں ایک پائیدار تبدیلی یا تشکیل نو ہوئی ہے، وہ علم وشعور اور نظریے کی اساس پر جدوجہد اور کوشش کرنے والی منظّم اجتماعیت کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ محض مار دھاڑ سے تو دنیا میں کوئی کام نہیں ہوتے۔ آج ہم نے یہ جو تشدد کا راستہ، دہشت گردی اور قتل و غارت گری کا راستہ اپنایا ہے، یہی خرابی کا راستہ ہے۔ علم وشعور کا راستہ، عدمِ تشدد کے اصول پر جدوجہد کرنا

www.rahimia.org

ہے۔ دیکھیے! ہم مسلمانوں کے زوال پر بہت کُڑھتے ہیں، مگر زوال سے نکلنے کے لیے ہم صحیح طریقۂ کار کے مطابق کام نہیں کرنا چاہتے۔ آپ بتلائیے کہ مسلمانوں کا یہ زوال جنگِ عظیم اوّل میں آپ کی خلافت کے بین الاقوامی نظام کے خاتمے سے ہوا۔ اس برعظیم پاک و ہند میں انگریز کی آمد اور مغلیہ سلطنت کے زوال سے شروع ہوا۔ آپ نے عسکری بنیادوں پر اس ملک کے اندر رہتے ہوئے 1857ء تک جدوجہد اور کوشش کی، لیکن شکست کھائی اور 1857ء سے لے کر 1919ء تک بہ شمول جنگِ عظیم اوّل 1914-18ء کے دورانیے میں بین الاقوامی طاقت کے ساتھ مل کر جنگ اس لیے لڑی کہ خلافتِ عثمانیہ ہماری بین الاقوامی حکومت تھی۔ 1920ء کے بعد سے دنیا میں ریاستیں قومی سطح پر وجود میں آنے لگیں۔ ہمارا بین الاقوامی راستہ ختم ہوگیا کیوں کہ بین الاقوامی نظام ٹوٹ گیا۔ اب اس کے بعد نئی قومی حکمتِ عملی کی ضرورت تھی۔

عدمِ تشدد کی حکمتِ عملی پر جدوجہد

برعظیم پاک و ہند کے علما کے سرخیل شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ (وفات 1920ء) جب مالٹا سے واپس آئے، پچاس سال انگریز کے خلاف مسلسل جدوجہد اور کوشش کی۔ اُن کی برپا کردہ تحریکِ ریشمی رومال — جو خلافتِ عثمانیہ کی بین الاقوامی طاقت کے تعاون سے ہندوستان سے برطانوی سامراج کو نکالنے کے لیے ایک عسکری جدوجہد اور کوشش تھی — ناکام ہوگئی۔ اس صورتِ حال میں سوال پیدا ہوا کہ کیا ناکامی کے بعد پھر بھی بندوق اٹھائے رکھیں؟ حضرت شیخ الہندؒ نے طریقۂ کار اور حکمتِ عملی تبدیل کی کہ اب عدمِ تشدد کے اصول پر اس اجتماعیت کی جدوجہد اور تحریک کے فروغ کے لیے کام کرنا ہے۔ اب قومی ریاستیں وجود میں آرہی ہیں تو اب ہمیں قومی جمہوری بنیادوں پر اپنی ریاستوں کی تشکیل کے لیے کردار ادا کرنا ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اسی ولی اللّٰہی فلاسفی کی اساس پر استنبول (ترکی) میں اور پھر مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر بین الاقوامی حالات کا جائزہ لینے کے بعد بات کی کہ قومی ریاستوں کے زمانے میں ہم جب تک اپنا قومی جمہوری نظام مضبوط نہیں بناتے، یہاں کی تمام نسلوں، فرقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر کے بنیادی اصولوں پر اپنے قومی امور؛ انتظامیہ، مقنّنہ، عدلیہ، وزارتِ داخلہ، وزارتِ خارجہ وغیرہ وغیرہ تشکیل نہیں دیتے، اس وقت تک ہماری طاقت اور قوت نہیں پیدا ہوسکتی۔ دشمن سے اپنے حقوق چھیننے کا راستہ عوامی اور جمہوری طور پر ہے۔ الغرض! حریت پسند علما نے پچاس ساٹھ ستر سال تک انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جنگ لڑی، خلافت کی بقا کے لیے کردار ادا کیا، تحریکِ خلافت چلائی، بین الاقوامی اسلامی نظام کی بقا کے لیے کردار ادا کیا۔

خلافتِ عثمانیہ کے بعد کی صورتِ حال

اس کے بعد مسلمانوں کے حالات بدلے اور ہماری طاقت ''خلافتِ عثمانیہ'' ٹوٹ گئی۔ جنگِ عظیم اوّل کے دو فاتح برطانیہ اور فرانس سامنے آئے اور پھر یورپ کی آپس کی بندر بانٹ میں جھگڑے اور لڑائیاں ہوئیں تو جنگِ عظیم دوم برپا ہوئی۔ اس کے دو فاتح روس اور امریکا سامنے آئے۔ ان چار ویٹو پاورز نے اقوامِ عالم کا نظام بنایا اور ریاستوں کی تشکیل کی۔ کیا ان چاروں میں سے کوئی ایک طاقت بھی اسلامی تھی؟ کوئی بھی نہیں۔ اس وقت بین الاقوامی نظام قائم کرنے والے یا سرمایہ داری نظام کے حامل تھے، یا سوشلزم کے۔ سوال یہ ہے کہ اب اُن کے زیرِ سایہ یا اُن کے ساتھ معاہدے کر کے جو ریاست وجود میں آئے گی، اس ریاست میں اسلام کا نظام قائم کیسے ہوگا؟ ایک ہی راستہ تھا کہ ہم قومی ریاست کی تشکیل کے اسلامی اصولوں کو سامنے رکھتے، وہ تو

www.rahimia.org

ہم نے پیشِ نظر نہیں رکھا۔ ہم سامراجی بین الاقوامی معاہدات میں جکڑ لیے گئے۔ چناں چہ آج آپ شرعی عدالت کے اندر جتنا مرضی سود پر بحث کرلیں اور ثابت کردیں کہ سود حرام ہے، لیکن آپ عملاً کچھ نہیں کرسکتے کیوں کہ عالمی نظام بریٹن وڈز کانفرنس (Bretton Woods Conference,1944) میں جب طے کرلیا گیا کہ دنیا بھر کا مالیاتی ڈھانچہ قرضوں کی معیشت اور سود کے اصول پر چلے گا، جسے چاروں ویٹو پاورز سمیت چوالیس ممالک نے قبول کرلیا۔ ایسے میں قومی طاقت حاصل کیے بغیر اُسے کیسے رد کیا جاسکتا ہے؟

پھر اسی طریقے سے 1947ء میں تجارت کے اصول اور گیٹ معاہدہ (GATT) سامنے آیا اور قرضوں کی معیشت کا معاہدہ سامنے آیا۔ عالمی بینک وجود میں آیا تو 1947ء کے بعد پاکستان کے سٹیٹ بنک نے آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک سے معاہدہ کرلیا۔ آپ ان معاہدات کے اندر بندھے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جب تک اپنی ریاستی طاقت، اپنے فیصلے خود کرنے اور ''رأیِ کُلّی'' کے مطابق اپنا سسٹم بنانے کا اجتماعی شعور بیدار نہیں کرتے، اپنے اندر علمی استعداد نہیں پیدا کرتے، اپنی اجتماعیت نہیں تشکیل کرتے تو محض دیوانے کا خواب ہی ہوگا کہ ایسی حالت میں ہماری قومی ریاست کی تشکیل ہو۔

مسلم اُمت کی موجودہ صورتِ حال

اسلام کے نام پر ملکوں کی جو تقسیم کی گئی، ایک خلافتِ عثمانیہ کے ستاوَن ملک بنا دیے گئے۔ ایک جزیرۃ العرب کو سعودی عرب، عمان، کویت، قطر، بحرین اور سات امارتوں میں بانٹ دیا گیا۔ اور پورے مشرقِ وسطیٰ کے حصے بخرے کردیے گئے۔ پورا افریقا بھی بندر بانٹ کرلیا گیا۔ اس برعظیم پاک و ہند کے سات آٹھ ملک بن گئے تو ملکوں کی تقسیم در تقسیم کیا اجتماعی طاقت پیدا کرے گی؟ حال یہ ہے کہ ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان ملک میں چلا جائے تو اس کو ریاستی اسلامی حقوق تک نہیں ملتے۔ وہ خارجی (foreigner) کا ''خارجی'' رہتا ہے۔ اس لیے قومی ریاستی دور کے اندر قومی طاقت کا پیدا کرنا ضروری تھا، مگر پراگندہ فکری کا یہ حال ہے کہ ہمارے ہاں اسلام کے نام پر پہلے قومیت کو حرام قرار دیا گیا کہ اسلام تو قومیت کا انکار کرتا ہے۔ حال آں کہ ریاستی حدود میں ہم اقوامِ متحدہ کے بین الاقوامی معاہدے سے جڑے ہوئے ہیں۔ پھر بھی کہتے ہیں کہ اسلام قومیت کا انکار کرتا ہے۔ یعنی معاہدے میں ہم اپنی ''قومیت'' مان رہے ہیں، لیکن قومیت کی اساس کو کفر قرار دے رہے ہیں۔ اسی طریقے سے ہم بین الاقوامی معاہدات کے تحت جمہوریت کے پابند ہیں، مگر جمہوری تصور کو ہی خلافِ اسلام بنانے کے لیے یہاں کے اسلام پسند ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں اور ''خلافت بمقابلہ جمہوریت'' کے نعرے لگاتے ہیں۔

اس صورتِ حال میں ولی اللّٰہی فکر کی عصری اہمیت

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اسلامی فکر کی اساس پر تین سو سال پہلے کہہ گئے کہ قانون ''جماہیر النّاس'' کا بننا چاہیے۔ اجتماعی طاقت وقوت اور پارلیمنٹ کے عقل مند لوگوں کی اساس پر نظام بننا چاہیے۔ مگر ہم نے امام شاہ ولی اللہ کا فکر چھوڑ کر خود ساختہ اسلامائزیشن، فرقوں کی بنیاد پر کی ہے۔ اس کے اثرات اور نتائج آج ہم بھگت رہے ہیں۔ شاہ صاحب کو کسی مفکر سے متأثر قرار نہیں دیا جاسکتا، مثلاً روسو جو شاہ صاحبؒ سے سولہ سال بعد فوت ہوا ہے۔ جنیوا میں پیدا ہوا۔ وہاں کی زبانوں میں اس نے تحریر لکھی تو کیا شاہ صاحبؒ نے وہ زبان پڑھی تھی؟ مارکس تو شاہ صاحبؒ سے سوسوا سو سال بعد آیا۔ ایڈم سمتھ کی کتاب سب سے

www.rahimia.org

پہلے 1776ء میں چھپی اور شاہ صاحبؒ 1735ء میں یہ بات کہہ رہے ہیں۔ اس طرح شاہ صاحبؒ پر تو یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ شاہ صاحبؒ نے یورپ کے کسی فلسفے سے متأثر ہوکر یہ بات کہی۔ ہاں! بعد کے اسلام پسندوں کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے کہ اُن کی سوچ کسی سے متأثر ہوکر پروان چڑھی ہو۔

غفلت دور کرنے اور عقل وشعور اپنانے کی ضرورت

آج ہمیں غفلت کے تمام پہلو ختم کرنے ہوں گے۔ یہ جو ہم نیند کی حالت میں ہیں اور افتراق و انتشار اور اجتماعیت گریز فرقہ واریت کے اندر مبتلا ہیں، اس سے نکل کر عقل وشعور اور فہم وبصیرت کی اساس پر دین کے اس نظامِ فکر وعمل پر غور کرنے کے لیے وقت نکالیں۔ میں اہلِ علم سے درخواست کروں گا کہ پوری توجہ کے ساتھ شاہ صاحبؒ کے اس علم وفکر کو پہلے اچھی طرح پڑھیے اور سمجھیے۔ پھر سوالات ضرور قائم کیجیے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ ہم نے بتا دیا، وہ حرفِ آخر ہے۔ یہ تو سوچنے کے مواقع ہیں۔ اس علم وفکر کو سمجھے بغیر بات آگے نہیں بڑھے گی۔ پڑھیے کہ شاہ صاحبؒ کا بنیادی فکر کیا ہے؟ وہ اجتماعیت کی تشکیل کے بنیادی امور کیا بیان کرتا ہے؟ معاشی نقطہ نظر سے کیا سسٹم بیان کرتا ہے؟ کون سا علمی منہج اور فکری ڈھانچہ مربوط طور پر بیان کرتا ہے اور اس پر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

یونیورسٹی انتظامیہ کے لیے کلماتِ تشکر

آخر میں مَیں ان لیکچرز کو یہاں منعقد کرانے پر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی انتظامیہ کا شکر گزار ہوں کہ ہمیں موقع دیا گیا کہ بات چیت اور گفتگو کے ذریعے سے ہم ایک مکالمہ کرسکیں۔ غور وفکر کی اس خوب صورت محفل کو سجانے کی وائس چانسلر صاحب نے منظوری دی، ان کا بھی شکریہ۔ اور موسیٰ پاک چیئر کے ہمارے محترم اور بہت ہی معزز اور بہت ہی علمی شخصیت مفتی ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب کا بھی شکریہ کہ انھوں نے یہ خوب صورت مجلس سجائی۔ شعبہ علومِ اسلامیہ کے سربراہ ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب صاحب کا شکریہ، انھوں نے پچھلی دفعہ ان موضوعات پر گفتگو کے لیے پُرخلوص دعوت دی اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اس دعوت کو قبول کرسکے اور اس مجلس میں ہمیں یہ بات کرنے کا موقع ملا۔

آخر میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا بھی شکر گزار ہوں کہ اُس نے توفیق دی کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر کی کچھ بنیادی باتیں بیان کی جاسکیں۔ یہ فکر ہمیں اپنے مرشد حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے، اپنے استاذ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ کی صحبت و تربیت اور بالخصوص امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں کے عمیق مطالعے سے اللہ تعالیٰ نے عطا کیا۔ اس میں جو صحیح اور حق ہے، تو یقیناً یہ اللہ کی توفیق سے ہے۔ اس میں جو ہم سے بیان کرنے میں کمی اور کوتاہی ہوئی تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور ہمیں اپنی اصلاح کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (35)

صدق اللّٰہ العظیم.

سوالات و جوابات

سوال: آپ نے مسلمانوں کے لیے قومی سطح پر نظام قائم کرنے کی بات کی، لیکن جب بات آئی بین الاقوامی نظام کی تو اس پر آپ نے دو طریقے تجویز کیے ہیں: (۱) طریقۂ حکما اور (۲) طریقۂ انبیا۔ اب دنیا کے اندر مسلمان سات ارب آبادی میں سے سوا ایک ارب کے قریب ہیں اور باقی لوگ غیر مسلم ہیں۔ ہر جگہ مسلمانوں کا یہی کہنا ہے کہ ہم نے اپنا نظام ساری دنیا پر نافذ کرنا ہے، تو دنیا ٹھیک ہوگی۔ اس کے بغیر نہیں۔ اس کے لیے آپ کیا تجویز (suggest) کرتے ہیں کہ کیا وہاں ''الرّأی الکُلّی'' نہیں ہونی چاہیے؟ جیسے ہم اپنے تئیں ''الرّأی الکُلّی'' چاہتے ہیں تو پوری دنیا کے حوالے سے بھی ''الرّأی الکُلّی'' ہونی چاہیے، ان کے اندر ہمیں بھی اپنی بات کہنے کا حق حاصل ہے۔ اور دوسروں کو بھی اپنی بات کہنے کا حق ہونا چاہیے؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ جو بات حکما اور انبیا علیہم السلام کے دو طریقوں کی کی گئی ہے، یہ صرف بین الاقوامی نظام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ان دونوں طریقوں کے قاعدے اور ضابطے قومی نظام اور بین الاقوامی نظام دونوں کے لیے ہیں۔ دنیا کی ہر قوم کا قومی نظام دو طریقوں میں سے کسی ایک پر ہوگا۔ اصولِ کلیہ کی بات ہو رہی ہے کہ ہر قوم اپنا قومی نظام یا تو حکما کے طریقے پر بناتی ہے یا انبیا کے طریقے پر بناتی ہے۔ اس کا صرف بین الاقوامیت سے کوئی تعلق نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی قوم اپنے جمہور کی اساس پر جو نظام بنائے گی، اس کی اچھائی کی جزا یا برائی کی سزا بھی تو اُسی کو بھگتنی ہے! ہمیں اُنھیں حق دینا چاہیے کہ وہ جس طریقے پر اپنا نظام بنانا چاہتے ہیں بنائیں، لیکن جس معاشرے میں مسلمان اکثریت میں ہیں تو اسلام کے بنیادی تقاضوں کے مطابق اُن کے ملک کا نظام بننا چاہیے۔ اگر کہیں یہودی ہیں، عیسائی ہیں، یا سوشلسٹ ہیں، ظاہر ہے ہم وہاں تو اپنا نظام مسلط نہیں کریں گے۔ وہاں تو اُن کے مطابق اُن کا نظام وجود میں آئے گا۔

سوال: کیا خلافت کا مطلب شخصی نظام نہیں؟

جواب: نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ خلافت کا مطلب بھی بین الاقوامی اجتماع کا ہے۔ اور وہ بھی کل اقوام کے انسانوں کا نمائندہ اجتماع ہے۔ اور وہ بھی اپنی نمائندگی کا کردار اُسی اجتماعیت کی اساس پر ہی قائم کرے گا۔

دوسری بات شاہ صاحبؒ جس حقیقت کو واضح کر رہے ہیں، وہ یہ کہ اگر قدیم زمانے میں لوگوں نے ''بَسۡطَةً فِي الۡعِلۡمِ وَ الۡجِسۡمِ ؕ'' (36) (علمی و جسمانی صلاحیت) کی اساس پر کسی شخص کو اپنا حکمران بنایا بھی ہے تو دراصل اُس کے ساتھ بھی اُمرا، علما، فقہا یا اُن کی اجتماعیّتوں کا نمائندہ اجتماعی ڈھانچہ کارفرما رہا۔ آج کی پولیٹیکل اصطلاح میں بھی ایسی شخصی حکومت ''آمریت'' کہلاتی ہے کہ جس میں قانون سازی کے اختیارات بھی اُسی فردِ واحد کے پاس ہوں، یعنی فرمانِ شاہی بھی وہی جاری کرتا ہو۔ اس پر عمل درآمد کے انتظامی اختیارات بھی وہ خود استعمال کرتا ہو۔ اپنے احکامات کے جواز (Justification) کے لیے عدالتی اختیارات بھی اُسی شخصیت میں مرتکز ہوں۔ یہی آمریت کہلاتی ہے، یہی فاسد ملوکیت کہلاتی ہے۔ اور یہی دراصل شخصی حکومت ہے۔

اب آپ بتائیں اسلام کے اس چودہ سو سالہ تاریخ میں کیا جو خلیفہ یا حکمران ہوتا ہے، وہ شخصی قانون سازی کرتا تھا؟ نہیں! قانون ہمیشہ قرآن حکیم کا ہوتا تھا۔ قرآن و سنت کی اساس پر مجتہدین اور علما کی جو فنی یا علمی قانون سازوں کی کمیٹی ہوتی تھی، وہ

قانون سازی کرتی تھی۔حکمران کے پاس صرف انتظامی اختیارات ہوتے تھے۔عدالت بھی آزاد ہوتی تھی۔اگر عدالت وقت کے حاکم کو اپنی عدالت میں بلا کر کیس کی سماعت کرتی ہے اور آزادانہ فیصلے کرتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ عدالت آزاد ہے۔

جمہوریت یہ ہوتی ہے کہ قانون سازی ایک جماعت کرے، اس قانون پر عمل درآمد کے انتظامی اختیارات دوسری جماعت کے پاس ہوں، جسے انتظامیہ کہا جاتا ہے۔اُس پر چیک اینڈ بیلنس (check and balance) کا اختیار ایک تیسرے ادارے یعنی عدلیہ کے پاس ہو۔اس کو اجتماعیت کہیں یا خلافت یا جمہوریت کا نام دیں۔شاہ صاحبؒ اس کی ہی بات کرتے ہیں۔

سوال: کیا ریاست کی قومی تشکیل کا تصوراسلامی ہے؟

جواب: قومی ریاستی تشکیل کے نظریے کو آپ کس اصول کے تحت کہیں گے کہ یہ غیر اسلامی ہے؟ سوسائٹی کی تشکیل وترتیب تو انتظامی امور میں سے ہے۔انتظامی امور بدلتے رہتے ہیں۔مثلاً کبھی حجاز ایک صوبہ تھا، نجد ایک صوبہ تھا، آج دونوں مل کر ایک ملک بن گئے ہیں۔انتظامی تقسیم کے امور جیسے بھی وقوع پذیر ہوجائیں، اُس میں اسلام کا سوفٹ وئیر (software) چل جائے گا۔ یوں سمجھ لیں کہ قومی ریاستی تشکیل ایک ہارڈ وئیر (hardware) ہے۔ہارڈ وئیر کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، جیسے ماضی میں کمپیوٹر بہت بڑے کمرے پر مشتمل ہارڈ وئیر کی صورت میں تھا۔اب موبائل فون میں بھی ایک پورا کمپیوٹر ہے۔تو گویا کہ اسلام ایک سافٹ وئیر ہے کہ جو ہر طرح کے انتظامی ڈھانچے میں اجتماعی مفاد کے حقوق کے تحفظ اور عدل وامن کے لیے بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔اس کو آج سمجھنے کی ضرورت ہے۔

سوال: یہ میری خلش ہے کہ وہ عدلیہ اور پارلیمنٹ جس نے قانون بنانا ہے، اس کی اکثریت جب قانون کا معنی نہ جانتے ہوں، یہاں شعبہ قانون سے وابستہ لوگ بھی بیٹھے ہیں۔تو ایسے پارلیمان اور ایسے ادارے جہاں اُن کو اپنی حیثیت کا شعور نہ ہو، تو وہاں ہم لوگ کیا کریں گے؟ آپ ہمارے لیے اس میں راستہ بتائیے۔؟

جواب: منتخب نمائندوں کا جو معیار (criteria) بیان کیا گیا ہے، وہی راستہ ہے کہ وہ باشعور ہوں، قومی تقاضوں سے واقف ہوں، امورِ ریاست کو سمجھتے ہوں اور قومی حلقوں کے حقیقی نمائندے ہوں۔وہ معیار آپ اختیار کریں گے اور اُس کی بنیاد پر جو پارلیمنٹ بنے گی، تو وہ انسانی سوسائٹی کے اجتماعی فیصلے کرے گی۔اب آپ کی پارلیمنٹ کا حال تو یہ ہے کہ پوری پارلیمنٹ سو رہی ہوتی ہے اور بل پاس ہوجاتا ہے۔ابھی پنجاب اسمبلی میں خواتین کے حقوق کا بل پاس ہوا ہے۔وہ انڈین قانون کا چربہ تھا۔ (37) اور پھر مستزاد یہ کہ خواتین کے لیے وہ قانون پاس ہوا تھا، مگر آپ نے دیکھا ہوگا ٹی وی پر کہ خواتین اراکین اسمبلی سے باہر نکلیں تو ان سے پوچھا گیا کہ یہ قانون عورتوں کے تحفظ کے لیے بنا ہے، آپ ذرا اس کی وضاحت کرسکتی ہیں؟ تو کسی نے کہا میں سوئی ہوئی تھی، کسی نے کہا میرا پرس یہاں تھا، کسی نے کہا بہت اچھا قانون ہے۔بس اس کے علاوہ انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔آپ خود بتائیے کہ اب ان کا منظور کردہ قانون اسمبلی کا منظور کردہ ہے یا چند مخصوص افراد کا منظور کردہ ہے؟

سوال: انسانی معاشرے میں ''روایت اور رسم ورواج'' کی حقیقت کیا ہوتی ہے؟ اس حوالے سے تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داری کیا ہے؟

جواب: شاہ صاحبؒ نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ انسان عقلی لحاظ اور اپنی مزاجی ترجیحات کے سبب ایک دوسرے

سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ حُبِّ جمال و لطافت، رائے کلی کے تقاضوں اور مفید تدابیر کی ایجاد و اختراع اور غور وفکر کی صلاحیتوں کے حوالہ سے تمام لوگ یکساں نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے ان میں ایک دوسرے کی صلاحیتوں، مہارتوں اور تجربات سے استفادہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ باہمی تعاون ان کی نوعی ضرورت قرار پاتی ہے۔ معاشرے کے اہلِ عقل اور صاحبِ فہم وشعور انسانوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ معاشرے کے عمومی مفاد میں بہتر رہنمائی کریں اور ضرورت کے مطابق متعلقہ ایجادات پر توجہ دیں۔ باقی افراد ان سے فائدہ اٹھائیں۔ عوام الناس ان پر اعتماد اس لیے کرتے ہیں کہ ان میں اس ضرورت کا احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ عقل و دانش، اخلاقِ عالیہ اور صالح ارتفاقات کی حامل اجتماعیت کی پیروی نہیں کریں گے تو انہیں مشکلات پیش آئیں گی۔ زندگی جمود کا شکار ہو جائے گی۔ اس لیے کہ رائے کلی اور حُبِّ جمال کے تقاضوں کی تکمیل انسان کے نوعی تقاضوں میں شامل ہے۔

شاہ صاحبؒ نے یہ بھی بتایا ہے کہ انسانی معاشرے میں روایات اور رواجات کی پذیرائی دو طریقوں سے ہوتی ہے:

1۔ ایک تو یہ کہ عوام الناس ان عناصر کی پیروی کرنے لگیں جو طاقت واقتدار کے مالک ہوں اور جن کی قوت کے سامنے وہ کسی قسم کی مزاحمت کرنے سے گریز کریں۔ یوں ان کے احکام کو قبول کر کے ان کو اپنا چلن بنا لیں اور وہ ان میں رواج کی حیثیت اختیار کر لیں۔

2۔ دوسرے وہ اعلیٰ اَخلاق کی مالک شخصیات ہوتی ہیں جو معاشرے کی اجتماعی فلاح کے لیے تدبر وحکمت کے ساتھ اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ معاشرے کی صالح اور فاسد روایات کو پرکھتی ہیں۔ صالح اجزا کو فاسد اجزا سے علاحدہ کر کے ان کو معاشرے کی ترقی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ یہ لوگ فاسد رواج کے نقصانات سے لوگوں میں آگہی پیدا کرتے ہیں۔ وہ بنی نوعِ انسان کے تقاضوں کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ انسانی تقاضوں کے مطابق درست اور مفید رسوم واصول کو ترویج دیتے ہیں۔ اسی بنا پر کسی بھی معاشرے کے عروج وزوال اور استحکام وانتشار میں ان عناصر کا کلیدی کردار ہوتا ہے، جو عوام الناس میں اپنا مثبت یا منفی اثر ورُسوخ رکھتے ہیں۔ اس لیے معاشرے میں صالح روایات کا قیام و بقا وہاں کے شعور اور بصیرت رکھنے والوں کی فکری و عملی اجتماعی جدوجہد پر منحصر ہوتا ہے۔

صدارتی کلمات

پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد چوہدری
قائم مقام وائس چانسلر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب، پروفیسر ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب صاحب، اس تقریب کے مہمانِ خصوصی مولانا مفتی عبدالخالق آزاد صاحب اور حاضرینِ مجلس! السلام علیکم!

شعبہ علومِ اسلامیہ موسیٰ پاک شہید چیئر کے تحت چار روزہ لیکچر سیریز کا آخری دن اور اختتامی تقریب ہے۔ مہمان مقرر مولانا

www.rahimia.org

مفتی عبدالخالق آزاد صاحب کے چند علمی اور تفصیلی لیکچرز تھے، جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات و نظریات کو سمجھنے میں طلبا و طالبات اور اہلِ علم کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے۔ آج کے دور میں ایسے لیکچرز کی بہت ضرورت اور اہمیت ہے، تا کہ اسلام کو آج کے دور کے حوالے سے سمجھا جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے سیاسی، معاشی اور سماجی تعلیمات میں جو جدید فکرِ اسلامی کی بنیاد رکھی ہے، آج اس کو سمجھ کر اسلامی معاشرے میں لانے کی ضرورت ہے۔ اس پروگرام کے انعقاد پر میں شعبۂ علوم اسلامیہ اور موسیٰ پاک شہید چیئر دونوں کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ یہ شعبہ اس سے پہلے بھی ایسے پروگرام کراتا رہا ہے، جو علم و تحقیق کے لیے بہت ضروری ہیں۔

بہت شکریہ!

حوالہ جات وحواشی

1۔ القرآن 158:7
2۔ صحیح بُخاری. باب ما ذکر عن بنی إسرائیل. حدیث 3455، طبع بیروت۔
3۔ صحیح مسلم، کتاب الإمارۃ، باب 53، حدیث نمبر 4950۔
4۔ القرآن 158:7۔
5۔ القرآن 29:18۔
6۔ القرآن 31:18۔
7۔ حُجّةُ اللّٰهِ البالِغة، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، باب انشقاق التّکلیف من التّقدیر، ج: 1، ص: 85، طبع: مکتبہ حجاز، دیوبند۔
8۔ القرآن 31:2۔
9۔ تفسیر جلالین، امام جلال الدین سیوطیؒ، تفسیر سورۃ البقرہ، ج: 1، ص: 8، طبع: قدیمی کتب خانہ، کراچی۔
10۔ حُجّةُ اللّٰهِ البالِغة، مبحث الارتفاقات، باب الارتفاق الأوّل، ص: 29-128۔
11۔ تفسیر البحر المحیط، سورۃ البقرۃ، تحت آیت 251۔
12۔ البُدُور البازغه، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ص: 77۔ طبع: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، سندھ۔
13۔ ایضاً، ص: 85۔
14۔ حُجّةُ اللّٰهِ البالِغة، ج: 1، ص 138۔
15۔ القرآن 100:12۔
16۔ البُدورُ البازِغه، ص: 92۔
17۔ ایضاً، ص 101۔
18۔ ایضاً، ص: 93۔
19۔ ایضاً، ص: 109
20۔ ایضاً، ص: 94-93۔

www.rahimia.org

21۔ ایضاً، ص: 07-106

22۔ ایضاً، ص: 91۔

23۔ ایضاً، ص 94۔

24۔ ایضاً، ص: 95-94۔

25۔ ایضاً، ص: 83۔

26۔ القرآن 2:247۔

27۔ **البُدورُ البازِغه، ص: 96۔**

28۔ القرآن 2:30۔

29۔ **حُجّةُ اللّٰهِ البالِغة، باب الرّسوم السّائرة فی النّاس، ج: 1، ص: 149۔**

30۔ ایضاً۔

31۔ ایضاً۔

32۔ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2577۔

33۔ **حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه، باب اقامة الارتفاقات و اصلاح الرسوم، ج: 1، ص 302۔**

34۔ **ایضاً، باب الرّسوم السّائرة فی النّاس، ص 151۔**

35۔ القرآن 11:88۔

36۔ القرآن 2:247۔

37۔ (i) The Protection of Women From Domestic Violence Act, 2005 (India)

(ii) The Punjab Protection of Women against Violence Act, 2016

38۔ القرآن 2:247۔

☆

www.rahimia.org

مطالعۂ تحریکاتِ آزادی

قومی اجتماعیت کے تقاضے اور علما کی ذمہ داریاں

خطبہ صدارت از حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
صدرِ اوّل جمعیت علمائے ہند

ترتیب وتخریج: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

www.rahimia.org

(جمعیت علمائے ہند برِعظیم پاک و ہند میں علمائے کرام کی ایک وقیع اور مؤقر جماعت تھی۔ اس جماعت کا سب سے پہلا ابتدائی اور تاسیسی اجلاس نومبر 1919ء میں دہلی میں خلافت کانفرنس کے موقع پر ہوا، جس میں پچیس علمائے کرام نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور مولانا محمد اکرم خاںؒ کا انتخاب اس حوالے سے ہوا کہ وہ جمعیت کے اغراض و مقاصد کا اجمالی خاکہ تیار کریں اور اگلے اجلاس میں پیش کریں۔ چناں چہ جمعیت کا پہلا اجلاسِ عام مؤرخہ ۵رتا ۹ر ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ/ 28ر دسمبر 1919ء تا یکم رجنوری 1920ء کو زیرِصدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلّی، اسلامیہ مسلم ہائی سکول امرتسر کے وسیع ہال میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں ایک رائے یہ بھی آئی کہ ''مسلم لیگ کی موجودگی میں مسلمانوں کی کسی نئی جماعت بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ... علمائے کرام کے کرنے کے لیے بہت سے میدان پڑے ہیں، مثلاً وہ اقتصادیات میں ترقی کرنے کی لوگوں کو ترغیب دیں۔ صنعت وحرفت کی ترقی پر وعظ کہیں یا بیان کریں۔ تعلیم یافتہ اشخاص کی شخصی طور پر اصلاح کریں۔'' اس کے جواب میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ نے جمعیت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

''یہ صحیح ہے کہ علما کے لیے اقتصادیات اور شخصی اصلاح کے وسیع میدان کھلے ہوئے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اقتصادیات وشخصیات کی اصلاح کرنے میں علما کی انفرادی حیثیت ہی مفید ہو اور انعقادِ جمعیت اس میں خلل انداز ہو، بلکہ میں کہتا ہوں کہ انفرادی حیثیت کے اعتبار سے جمعیت علما کی متفقہ طاقت زیادہ اصلاح کرسکتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اقتصادیات وشخصیات کی اصلاح تو علما کا فرض ہو اور سیاسیات کو مذہبی دائرے سے خارج سمجھ کر اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جائے، جو مذہبی معلومات پر چنداں عبور نہیں رکھتے۔''

اس کے بعد متفقہ رائے سے جمعیت علمائے ہند کے قیام کا فیصلہ ہوا اور حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ نے اس کے اغراض و مقاصد کا اجمالی خاکہ پیش کیا۔ اس کی روشنی میں جمعیت کے اساسی اصول اور ضوابط قائم کرنے کے

لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ چناں چہ یکم/جنوری 1920ء کو حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کی زیرِصدارت منعقدہ اجلاس میں مجلسِ منتظمہ بنائی گئی اور اس موقع پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی عدم رہائی پر سخت اضطراب اور بے چینی کے اظہار پر مبنی ایک پیغام بنام وائسرائے ہند منظور کیا گیا۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ جون 1920ء میں ہندوستان تشریف لائے۔ آپؒ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تاسیسی اجلاس مؤرخہ ۱۶/صفر ۱۳۳۹ھ/ 29/اکتوبر 1920ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جامع مسجد میں خطبہ صدارت میں اپنے سیاسی فکر و عمل کا اظہار کیا۔ اُس کے بعد جمعیت علمائے ہند کے سالانہ اجلاسِ دوم منعقدہ مؤرخہ ۷، ۸، ۹/ ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ/ 19، 20، 21/نومبر 1920ء بہ مقام دہلی میں ایک وقیع خطبہ صدارت پیش کیا تھا۔

یہ خطبۂ صدارت حضرت شیخ الہندؒ نے تحریر فرمایا تھا، لیکن علالت کے باعث حضرتؒ خود اس خطبۂ صدارت کو شرکائے اجلاس کے سامنے پیش نہ فرما سکے تھے۔ یہ خطبۂ صدارت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے جمعیت علمائے ہند کے افتتاحی اجلاس میں پڑھ کر سنایا تھا۔

جمعیت کے اس سالانہ اجلاسِ دوم کے آخری اجلاس منعقدہ 21/نومبر 1920ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے اپنا اختتامی بیان تحریری صورت میں جاری فرمایا۔ یہ بیان گویا کہ حضرتؒ کے اس خطبۂ صدارت کا اختتامیہ ہے، جس میں بہت اہم نکات پر مشتمل اپنے بنیادی افکار واضح کیے ہیں اور ہدایات جاری کی ہیں۔

جمعیت علمائے ہند کے اس خطبے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ صرف دس دن اس دارِ فانی میں رہے۔ آپؒ ابھی دہلی میں ہی ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ کے مکان پر مقیم تھے اور اُن کے زیرِ علاج تھے کہ پیامِ اجل آ پہنچا۔ چناں چہ 30/نومبر 1920ء کو آپؒ اس دنیائے فانی سے اپنے ربّ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوگئے۔ وصال کے بعد آپؒ کا جنازہ دیوبند لایا گیا اور اپنے عظیم استاد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پہلو میں ''مقبرۂ قاسمی'' دیوبند میں دفن کیے گئے۔ اس طرح اپنے ولی اللّٰہی اور قاسمی سلسلے کے بزرگوں کی ارواحِ مقدسہ کے ساتھ جا ملے۔ اللہ تعالیٰ آپؒ کے درجات بلند فرمائے اور آپؒ کے فکر و عمل کو پوری اُمت میں پھیلانے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

آئندہ صفحات میں حضرت شیخ الہندؒ کا یہ جامع اور وقیع خطبہ صدارت تحقیق و تخریج کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ آیات اور احادیث کے حوالہ جات اور اہم مقامات پر حواشی بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ نیز ہم نے ذیلی عنوانات بھی قائم کردیے ہیں، تاکہ استفادہ کرنا آسان ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الہندؒ کے افکار و خیالات کو سمجھنے اور انھیں فروغ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ مدیر اعلیٰ)

خطبہ صدارت

از حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

(آغاز از دعائے مسنونہ)

اللّٰھمّ! لک الحمد. أنت قیّم السّماوات و الأرض، و مَن فیھنّ. و لک الحمد، أنت ملک السّماوات و الأرض، و مَن فیھنّ. و لک الحمد، أنت نور السّماوات و الأرض، و من فیھنّ. و لک الحمد، أنت الحقّ، و وعدک الحقّ، و لقآءک حقٌّ، و قولک حقٌّ، و الجنّة حقٌّ، و النّار حقٌّ، و النّبیّون حقٌّ، و محمّد حقٌّ، و السّاعة حقٌّ.

اللّٰھم لک أسلمتُ، و بک آمنتُ، و علیک توکّلتُ. و إلیک أنبتُ، و بک خاصمتُ، و إلیک حاکمتُ. فاغفر لی ما قدّمتُ، و ما أخّرتُ، و ما أسررتُ، و ما أعلنتُ. أنت المُقدِّم، و أنت المُؤخِّر، لا إلٰہ إلّا أنت. (1)

اللّٰھم صلّ و سلّم علیٰ عبدک، و رسولک، محمّد الّذی جاء بالبیّنات، و علیٰ أصحابہٖ أجمعین. یا حیُّ یا قیُّوم برحمتک نستغیث. أغثنا و نجّنا من القوم الظّالمین. برحمتک یا أرحم الرّاحمین.

(اے اللہ تیرے لیے ہی سب تعریفیں ہیں۔ تُو آسمان وزمین اور جو بھی کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کو قائم رکھنے والا ہے۔ تیرے لیے ہی سب تعریفیں ہیں۔ تُو آسمان اور زمین اور جو کچھ اس میں ہے، کا مالک ہے۔ اور تیرے لیے ہی سب تعریفیں ہیں۔ تُو ہی آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے، کا نور ہے۔ اور تیرے لیے ہی سب تعریفیں ہیں۔ تُو حق ہے۔ تیرا وعدہ برحق ہے۔ تجھ سے ملاقات حق ہے۔ تیری بات سچی اور حق ہے۔ جنت حق ہے۔ جہنم حق ہے۔ تمام نبی برحق ہیں۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم حق ہیں۔ اور قیامت حق ہے۔

اے اللہ! میں تیرا فرماں بردار اور مطیع ہوں۔ اور تجھ پر ایمان لاتا ہوں۔ تجھ پر بھروسہ رکھتا ہوں اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔ تیری مدد سے ہی (دشمنوں سے) لڑتا ہوں۔ تیری طرف ہی فیصلوں میں رجوع کرتا ہوں۔ پس تُو میرے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کردے۔ وہ گناہ جو میں نے چھپ کر کیے اور وہ گناہ بھی، جو میں نے ظاہری طور پر کیے۔ تُو ہی سب سے پہلے ہے۔ تُو ہی سب سے آخر میں ہے۔ تیرے علاوہ اَور کوئی خدا نہیں ہے۔

اے اللہ! اپنے بندے اور رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیج کہ جو واضح دلائل لے کر دنیا میں تشریف لائے۔ اور اُن کے تمام صحابہؓ پر بھی درود وسلام بھیج۔ اے حیّ و قیّوم ذات! تیری رحمت سے ہی ہم مدد

www.rahimia.org

چاہتے ہیں۔ ہماری مدد فرما اور اے ارحم الراحمین! اپنی رحمت سے ہمیں ظالم قوم سے نجات عطا فرما۔)

(شکریے کے کلمات)

أمّا بعد! خاکسار ذرّۂ بے مقدار، حضرات علمائے کرام، و معزز اہل اسلام، و برادرانِ وطن کی خدمت میں عرض رساں ہے کہ آپ حضرات نے مجھ جیسے ناچیز وضعیف کو جس عظیم الشان خدمت (اس اجلاس کی صدارت) کے لیے منتخب فرمایا ہے، میں اس کے لیے آپ کی محبت وعزت افزائی کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(قومی اجتماع کی صدارت کے ضروری لوازمات)

اس کے ساتھ ہی یہ التماس کرتا ہوں کہ صدارت کی ذمہ داری کی اہمیت اور زمانۂ حاضرہ کی ہوش رُبا کشمکشِ موت و حیات پر نظر کرتے ہوئے، مَیں اپنی گزشتہ پنج (پانچ) سالہ (مالٹا میں) قیدِ غربت (جلاوطنی کی قید) اور اب موجودہ ممتدّ علالت (لمبی بیماری) کے سبب سے صدارت کی خدمت سے اپنے آپ کو قاصر پاتا ہوں۔ کیوں کہ ایسے نازک اور پُرخطر زمانے میں کسی عظیم ملّی اور قومی اجتماع کی صدارت کے لیے ضروری تھا کہ صدر:

(الف) تمام جزئیات سے واقف ہو۔ (ب) اور نہ تھکنے والی دماغی قوت

(ج) اور نہ متزلزل ہونے والی قلبی عزیمت (د) اور نہ سست ہونے والے اعضا و جوارح کی طاقت رکھتا ہو۔

(خدمتِ اسلام کے لیے تیار ہوں)

بہ ایں ہمہ آپ حضرات (علمائے کرام) نے مجھے ایک دینی وقومی خدمت کے لیے (صدر) نامزد اور منتخب کر دیا تو میرے لیے سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ بہ نامِ خدا اس کے لیے سرِ تسلیم خم کر دوں اور خدا کی تائید پر بھروسا کر کے خدمتِ اسلام اور اہلِ اسلام کے لیے تیار ہو جاؤں۔

معزز حاضرین! میری اس عاجزانہ التماس پر پوری توجہ مبذول فرمائیں کہ کئی مہینے کی مُمتدّ علالت (لمبی بیماری) کی وَجہ سے مجھے پورے اطمینان سے (ملکی حالات پر) غور و خوض کا موقع نہیں ملا ہے۔ اس لیے معروضات میں اگر کسی قسم کی کوتاہی ہو، مضامین منتشر ہوں تو میرے واقعی عذر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے معاف فرمائیں۔

و العُذر عند کِرام النّاس مقبول (معزز لوگ معذرت قبول کرتے ہیں)۔

(اس اجلاس کی فضیلت اور مشورے کی اہمیت)

محترم حاضرین! آج جس اجلاس میں آپ تشریف فرما ہیں اور طویل وعریض سفر برداشت کر کے شریک ہوئے ہیں، یہ وہ مقدس اجتماع ہے، جس کا سنگِ بنیاد بہ حکم (خداوند تبارک و تعالیٰ):

1۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ [2] (اور ان سے کام میں مشورہ لیجیے)

2۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ [3] (اور ان کا معاملہ آپس میں مشورے کا ہے)

3۔ وَ تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَ التَّقْوٰی ؕ (4) (اور وہ نیکی و تقوے کے کاموں میں مشورہ کرتے ہیں)

رکھا گیا ہے۔ یعنی حضرت حق جل شانہٗ نے اپنے حبیبِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم فرمایا کہ:

''آپ اپنے اصحابِ کرام سے مشورہ فرمایا کریں۔'' (5)

اور پھر مسلمانوں کی شان بھی یہی بیان فرمائی کہ وہ اپنے اُمور کا آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کرتے ہیں۔ جس سے صاف طور سے ثابت ہوگیا کہ مسلمانوں کے تمام کام، بالخصوص ایسے کام جن کا مسلمانوں کی تمام جماعت سے تعلق ہے، آپس کے مشورے سے ہونے چاہئیں۔

(مجلس مشاورت نیکی اور خوفِ خدا پر مبنی ہونی چاہیے)

یہ حکم تو ایسے جلسوں اور اجتماعوں کے جواز کی بنیاد ڈالتا ہے، جو بہ غرضِ مشورہ منعقد کیے جائیں اور ارشادِ (ربانی):

وَ تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَ التَّقْوٰی ؕ (6) (اور وہ نیکی و تقوے کے کاموں میں مشورہ کرتے ہیں)

ان جماعتوں کی نوعیت کی تائید کرتا ہے، یعنی مجلسِ مشاورت کا نیکی اور خوفِ خدا پر مبنی ہونا لازم ہے۔ پس ایسے تمام جلسے:

(الف) جن کا مقصد دینِ مقدس کی حمایت و حفاظت ہو،

(ب) اور جن میں نیکی اور بھلائی کے طریقوں پر غور کیا جائے،

(ج) اور جن میں خدائے تعالیٰ قدوس کا خوف شاملِ حال رہے،

منعقد کرنا اور ان میں شریک ہونا حکمِ خداوندی کی تعمیل اور سنت رسولؐ کی اقتدا ہے۔

(دورِ حاضر میں دشمن قوتوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونا فرض ہے)

چوں کہ دورِ حاضر میں دشمنانِ اسلام نے مقاماتِ مقدسہ (حرمین شریفین اور شام و فلسطین) کو غصب کر کے اور اقتدارِ خلافت کو پامال کر کے مسلمانوں کے واجب الاحترام جان و مال سے زیادہ عزیز مذہب (اسلام) کی توہین کی (ہے)۔ اور ان کے دینی بھائیوں کی جان و مال، عزت و آبرو کو برباد کیا۔ اس لیے تمام روئے زمین کے مسلمانوں پر فرض ہوگیا ہے کہ وہ اپنے دینی بھائیوں کی نصرت و اعانت (مدد اور تعاون) کریں اور اپنے پاک و مقدس مذہب کی حفاظت اور اعدائے اسلام کی مدافعت کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اس فرض میں چین، جاوا، ہندوستان، افغانستان، ترکستان، بخارا وغیرہ کے مسلمان (سب) برابر ہیں۔ کسی کی تخصیص نہیں۔ جن مقامات میں لڑائی ہوئی ہے، جس طرح وہاں کے مسلمانوں پر فرض تھا کہ اپنے بھائیوں کی مدد اور دشمن کی مدافعت کریں، اسی طرح روئے زمین کے مسلمانوں پر ایشیائی اور یورپین مظلوم مسلمانوں کی امداد و اعانت اور دشمن کی مدافعت کرنا فرض ہے۔ اگرچہ امداد و اعانت کی صورت مختلف اور مدافعت کی نوعیت جداگانہ ہوگی۔

(جمعیت علمائے ہند کے سامنے یہ فریضہ سب سے اہم ہے)

جمعیت علمائے ہند کے سامنے جہاں اَور مذہبی اور علمی فرائض ہیں، وہاں اس وقت یہ فریضہ بھی اس کے پیشِ نظر ہے، بلکہ تمام دیگر فرائض سے مقدم اور اہم ہے۔

www.rahimia.org

(مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اتحاد)

رہا یہ سوال کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا بیرونِ ہند کے مسلمانوں کے ساتھ ایسا کون سا شدید تعلق ہے؟ جس کی وَجہ سے ان پر سات سمندر پار کے رہنے والوں کی جانی اور مالی امداد فرض ہوجائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے اپنے پیروؤں (ماننے والوں) اور کلمہ گویوں کے درمیان ایک ایسا رشتۂ اتحاد و اخوت قائم کیا ہے، جو تمام قومی مصنوعی اتحادات سے بالاتر ہے۔ اس میں قومیت اور لباس اور رنگ کا امتیاز نہیں۔ صرف خدائے واحد پر ایمان لانا ایک مغربی شخص کو اقصائے مشرق (مشرق کے آخری کونے) میں رہنے والے کا بھائی بنا دیتا ہے۔ اور ان **بُعد المَشرِقَین** (مشرق و مغرب کی دوری کے فاصلے) کے رہنے والوں کے درمیان وہ تمام تعلقات قائم ہوجاتے ہیں، جو ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے ساتھ حاصل ہوتے ہیں۔

(مسلمانوں کے باہمی تعلق پر قرآن وسنت کے ارشادات)

حضرت حق جل شانہٗ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ [7] (تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں)

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''**إنّ حقّاً علیٰ المؤمنین أن یتوجّع بعضهم لبعض، کما یألم الجسد للرّأس.**'' [8]

(تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ ایک دوسرے کے لیے ایسے درد مند ہوں، جیسے سر کے درد سے تمام اعضائے بدن دُکھ پاتے ہیں۔)

دوسری جگہ ارشادِ (نبویؐ) ہوتا ہے:

''**المؤمنون کرجل واحد إن اشتکیٰ عینهٗ اشتکیٰ کلّهٗ. و إن اشتکیٰ رأسهٗ اشتکیٰ کلّهٗ.**'' [9]

(تمام مسلمان ایک آدمی کے جسم کی طرح ہیں۔ اگر اُس کی آنکھ میں درد ہوتو تمام بدن دُکھ اٹھاتا ہے اور اگر اُس کے سر میں درد ہوتو تمام بدن تکلیف پاتا ہے۔)

اسی طرح ایک مسلمان کے درد اور دُکھ سے تمام مسلمانوں کو درد اور تکلیف پہنچنا ضروری ہے۔

خدائے پاک کے فرمان اور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ارشاد سے یہ صاف ثابت ہوگیا کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے درد سے اسی قدر صدمہ ہونا چاہیے، جس قدر ایک عضو کی تکلیف سے دوسرے اعضا کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس مثال سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ایمان اسی وقت کامل ہوگا، جب کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کی تکلیف سے ایسی ہی بے اختیاری اور اضطراری طور پر تکلیف پہنچے، جس طرح ایک عضو کی دوسرے اعضا کی تکلیف سے ایسی ہی بے اختیاری اور اضطراری ہوتی ہے۔

ایک اَور حدیث میں ارشاد فرمایا ہے:

www.rahimia.org

''المسلم أخو المسلم لا یظلمهٗ و لا یسلمهٗ.'' (10)

و فی روایة المسلم: ''ولا یظلمهٗ و لا یخذلهٗ و لا یحقرهٗ.'' (11)

(ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے دشمن کے پنجے میں چھوڑتا ہے۔ اور (صحیح) مسلم کی روایت میں ہے کہ: نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کی نصرت اور مدد سے منہ موڑے۔ نہ اسے حقیر سمجھے۔)

ایک اَور حدیث میں ارشاد فرمایا ہے:

''ما من امریء مسلم یخذل امرءً مسلماً فی موضعٍ تُنتهک فیه حرمتهٗ، و یُنتقص فیه من عرضهٖ إلاَّ خذله اللّٰه فی موضع یحبّ فیه نصرتهٗ. و ما من امریء مسلم ینصر مسلماً فی موضع یُنتقص فیه من عرضهٖ، و یُنتهک فیه من حرمتهٖ إلاَّ نصرهٗ اللّٰه فی موطن یحبُّ فیه نُصرتهٗ.'' (12)

(جو مسلمان کسی مسلمان کی ایسے موضع (موقع) میں مدد نہ کرے، جہاں اس کی بے عزتی کی جاتی ہے اور آبرو پامال ہوتی ہو تو خدا اس کی اس جگہ مدد نہ کرے گا، جہاں وہ خدا کی مدد چاہتا ہے۔ اور جو مسلمان کسی مسلمان کی ایسی جگہ مدد کرے گا، جہاں اس کی عزت خراب اور بے آبروئی ہو رہی ہے تو خدا اُس کی اس جگہ مدد کرے گا، جہاں وہ خدا کی مدد چاہتا ہے۔)

(ایک اَور حدیث میں ہے:)

''المؤمن أخو المؤمن، یکفّ عنهٗ ضیعته، و یحوطهٗ من ورائهٖ.'' (13)

(مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اس کو ہلاکت سے بچاتا ہے اور پس پشت اس کی حفاظت کرتا ہے۔)

یہ ہیں خدائے برتر اور اس کے پاک رسولؐ کے صریح فرمان۔ اور یہ ہیں مقدس مذہبِ اسلام کے جلیل القدر احکام، جن کی وَجہ سے ہندوستان کے مسلمان اپنے سمندر پار کے مذہبی بھائیوں کی امداد اور اعانت کو اپنا مذہبی پاک فریضہ سمجھتے ہیں۔ اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اگر ہم نے اس حالتِ دردناک میں بھی ان کی بات نہ پوچھی، کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے رہے اور ان کو دشمنوں کا تختۂ مشق بن جانے کے لیے چھوڑ دیا اور ان کی امداد و اعانت میں امکانی کوشش نہ کی تو قیامت کے دن خدائے جلیل و جبار کے قہر سے چھٹکارا مشکل ہے۔

(باہمی معاہدات کا عالمی طریقہ اور رشتۂ اسلام)

اسلام سے پہلے قومی زندگی قائم رکھنے اور بنی نوعِ (انسان) کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اقوامِ عالم کا یہ طریقہ تھا کہ ایک دوسرے کے ساتھ ''حِلف'' یعنی معاہدہ کرلیا جاتا تھا۔ دونوں معاہد قومیں ایک دوسرے کی مددگار ہوتی تھیں۔ ایک دوسرے کی طرف سے دشمنوں سے لڑتی تھیں۔ معاہدے کی یہ رسم غیر مسلم اقوام میں آج تک جاری ہے۔

اسلام نے ''حِلف''، یعنی ''معاہدۂ نصرت'' کو مسلمانوں کے لیے آپس میں غیر ضروری قرار دیا، (14) مگر غیر ضروری قرار دینے کا منشا یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کو متفقہ قومی طاقت یا باہمی معاونت کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کی وَجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو خود اُن کے

پاک مذہب نے باہمی نصرت و اعانت کی ایسی مضبوط زنجیر میں جکڑ دیا ہے، جو انسانی معاہدۂ نصرت سے کہیں زیادہ مضبوط اور استوار ہے۔ جس وقت کسی شخص نے

لا إلٰہ إلاَّ اللّٰہ محمّد رّسول اللّٰہ

کہہ لیا، اسی وقت سے وہ مسلمانوں کا بھائی ہوگیا۔ خواہ وہ اقصائے (دُور) مغرب کا رہنے والا ہو یا منتہائے (انتہائی) مشرق کا، گورا ہو یا کالا، کچھ تفاوت (فرق) نہیں۔

(عالمی معاہدات کے فوائد اور مقاصد)

بات یہ ہے کہ معاہدہ کرنے والے معاہدے سے تین فائدے حاصل کرتے تھے:

(۱) اوّل یہ کہ ایک معاہد (معاہدہ کرنے والا) دوسرے کے حملے سے محفوظ ہوجاتا تھا۔

(۲) دوسرے یہ کہ کسی تیسرے حملہ آور دشمن کے ساتھ مل کر اس سے لڑنے کا خطرہ نہیں رہتا تھا۔

(۳) تیسرے یہ کہ اگر یہ کسی دشمن پر حملہ کرے تو (دوسرا) معاہد اس کی مدد کرے۔

(مسلمانوں پر یہ تینوں باتیں فرض ہیں)

یہ تینوں باتیں ہر مسلمان پر اسلام لاتے ہی فرض ہوجاتی ہیں۔ مثلاً:

(۱) پہلی بات کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے حملے سے محفوظ ہوجائے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے:

''**سِباب المسلم فُسوق و قتالهٔ کفر.**'' (15)

(مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس پر حملہ کرنا کفر ہے۔)

دوسری حدیث میں فرمایا:

''**کُلّ المسلم علیٰ المسلم حرام، دمهٗ، و مالهٗ، و عِرضهٗ.**'' (16)

(یعنی مسلمان کو دوسرے مسلمان کے جان و مال اور آبرو پر حملہ کرنا حرام ہے۔)

تیسری حدیث میں ارشاد ہے:

''**ألا! ... لا ترجعنّ بعدی کفّاراً یضرب بعضکم رقاب بعض.**'' (17)

(دیکھو! میرے بعد کافروں کی طرح نہ ہوجانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارو۔)

اَور حق تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

وَ مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِیْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا ﴿۹۳﴾ (18)

(جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کردے تو اس کا بدلہ جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اُس پر خدا کا غضب اور لعنت نازل ہوگی اور اس کے لیے خدا تعالیٰ نے بڑا عذاب مہیا کیا ہے۔)

www.rahimia.org

(۲) اور دوسری بات کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی جانب سے یہ خوف نہ کرے کہ وہ میرے دشمن کے ساتھ ہوکر میرے اوپر حملہ کرے گا۔ اس کے متعلق ارشاد ہے:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ (19)

(یعنی مسلمان' کافروں کو اپنا دوست مسلمانوں کے خلاف نہ بنائیں کہ کفار کی طرف ہوکر مسلمانوں سے لڑیں۔)

تفسیر ابن جریر (طبری) میں اسی آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

''و معنی ذٰلک لا تتّخذوا أیّها المؤمنون الکفّار ظهراً و أنصاراً، توالونهم علیٰ دینهم، و تظاهرونهم علیٰ المسلمین من دون المؤمنین.'' (20)

(یعنی معنی اس آیت کے یہ ہیں کہ اے مسلمانو! کفار کو اپنا مددگار اور حمایتی نہ بناؤ کہ ان کافروں سے تم ان کے دین میں دوستی کرو اور ان کی مسلمانوں کے خلاف مدد کرو۔)

(۳) تیسری بات کہ اگر مسلمان کسی دشمنِ اسلام پر حملہ کرے تو تمام مسلمان اس کی مدد کریں۔ اس کے متعلق حضورؐ کا صاف و صریح ارشاد موجود ہے کہ:

''المؤمن تکافأ دماء هم و هم ید علیٰ من سواهم.'' (21)

(تمام مسلمان دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں ایک ہی ہاتھ ہیں۔)

یعنی دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں تمام مسلمانوں کو اس طرح متفقہ طاقت سے کام لینا چاہیے کہ گویا ان سب کی حرکت ایک ہاتھ کی حرکت ہے۔

(مسلمانوں کو آپس میں رسمی معاہدے کی ضرورت نہیں)

پس جب کہ مسلمانوں کے لیے رسمی معاہدے کی تمام ذمہ داریاں صرف اسلام لانے سے حاصل ہوجاتی ہیں تو مسلمان کو مسلمان سے معاہدہ کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ رہا مسلمانوں کا کسی دوسری قوم سے معاہدہ کرنا اور جب تک دوسرا فریق بدعہدی نہ کرے، اس پر قائم رہنا' یہ علاحدہ چیز ہے۔

(مسلمانوں میں باہمی نصرت کا معاہدہ خدائے قدوس کا حکم ہے)

اب دیکھنا یہ ہے کہ آج کل کی دنیا کی وہ قومیں:

(الف) جو اپنے رسمی معاہدوں کو واجب الاحترام سمجھتی ہیں۔

(ب) یا (وہ سمجھتی ہیں کہ) اُن کو یہ حق ہے کہ وہ مسلمانوں کو اس آسمانی معاہدے اور مذہبی حلف سے روک دیں۔

(ج) یا (وہ قومیں) یہ کہہ سکیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ٹرکی یا عراق یا شام کے مسلمانوں سے کیا واسطہ؟ یہ خواہ مخواہ کیوں چیخ و پکار کرتے ہیں؟

ہم تمام ایسے لوگوں سے بہ بانگِ دُہل (علیٰ الاعلان) کہے دیتے ہیں کہ مسلمانوں میں باہمی نصرت و معاونت کا معاہدہ انسانی معاہدہ نہیں ہے، بلکہ خدائے قدوس کا قائم کیا ہوا اور سخت تاکیدی مذہبی احکام کا قرار پایا ہوا معاہدہ ہے۔

www.rahimia.org

(مسلمانوں کی جائز مذہبی جدو جہد غیر آئینی نہیں)

اگر تمھارے اپنے قائم کیے ہوئے معاہدے تمھیں مجبور کرتے ہیں کہ امریکا والے آ کر یورپ میں تمھاری مدد کریں اور ان کی یہ مدد آئین و انصاف کے خلاف نہ سمجھی جائے تو مسلمانوں کو ان کا خدا، ان کا رسول، ان کا پاک مذہب حکم کرتا ہے کہ وہ اپنے دینی بھائیوں کی مدد کریں۔ خواہ وہ کہیں کے رہنے والے ہوں۔

کسی انسانی قانون و طاقت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرائض سے روکے یا ان کی جائز مذہبی جدو جہد کو غیر آئینی قرار دے۔

(مسلمانوں کی حالیہ بے چینی کے اسباب)

یہاں پر طبعًا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے واقعات ہیں، جنھوں نے مسلمانوں کو اس قدر بے چین اور مضطرب کر دیا ہے؟ اور کیا اسباب ہیں، جن کی وجہ سے بیرونِ ہند کے رہنے والے بھائیوں سے ہمدردی اور ان کی اعانت فرض ہوگئی ہے؟

اس کا جواب دینے اور (اِسے) سننے کے لیے پتھر کا دل اور فولاد کا کلیجہ درکار ہے۔ اور اس کی تفصیل کے لیے بہت زیادہ وقت کی ضرورت ہے۔ اس لیے اوّل تو اپنے (جسمانی) ضعف کی وَجہ سے، دوسرے اس لیے بھی کہ بہت سارے واقعات اور مظالم اخباروں اور تحریروں کے ذریعے سے عالَم پر آشکار (پوری دنیا کے سامنے واضح) ہو چکے ہیں، صرف چند جملوں پر اختصار کرتا ہوں۔

(ا۔ خلافتِ اسلامیہ کے علاقوں کی نوچ کھسوٹ)

معزز ناظرین! دنیائے اسلام میں گزشتہ چند صدیوں سے سلطانِ ٹرکی کی واحد سلطنت' اسلامی شوکت کی ضامن تھی۔ اور حرمین محترمین، بیت المقدس، عراق وغیرہ کے تمام اماکنِ مقدسہ و مقاماتِ محترمہ کی حفاظت کی کفیل تھی۔ جمہورِ اسلام کے اتفاق سے سلطانِ ٹرکی خـلیـفـۃُ الـمسـلـمین (مسلمانوں کے خلیفہ اور حکمران) مانے جاتے تھے۔ اور خلافت کے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتے تھے۔

ان کا عروج و ترقی اور ان کی سلطنت کی وسعت جابر و غاصب سلطنتوں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ اور وہ ہمیشہ اسی فکر میں لگی رہتی تھیں کہ خلیفۃُ المسلمین کا اقتدار گھٹایا جائے اور مستقر (مرکزِ) خلافت پر قبضہ کر کے یورپ سے اسلام کا نام و نشان مٹایا جائے۔ اگر چہ سلطانِ ٹرکی پر، اِن مسیحی بھیڑیوں کے درمیان بالکل ''۳۲ دانتوں میں ایک زبان'' کی مثل صادق تھی، مگر خـلیفۃُ المسلمین کی اسلام کے لیے جانبازانہ مقاومت (دلیرانہ مقابلہ) ان غاصبوں کی متعصّبانہ خواہشیں پوری نہ ہونے دیتی تھیں۔ تاہم ان دشمنانِ اسلام کے دندانِ عاض (کاٹنے والے دانت) غریب ٹرکی کے بدن میں سے گوشت کے لوتھڑے نوچتے رہے اور 1877ء (میں سربیا کے علاقے پر قبضے) سے تو اس نوچ کھسوٹ کا متواتر ایک سلسلہ قائم ہوگیا۔ (1885ء میں) مصر جیسا زرخیز علاقہ، (1878ء میں) قبرص (سائپرس پر)، (1912ء میں) طرابلس، سالونیکا، یونان، بلغاریہ، سروِیا، البانیہ وغیرہ ٹرکی (کے) علاقے یکے بعد دیگرے ان ظالموں کی جُوعِ الذِّئب (بھیڑیے کی بھوک) کی بھینٹ چڑھ گئے اور یہ ان (ملکوں پر مشتمل) بڑے بڑے لقموں کو (ایسے) ہضم کر گئے کہ ڈکار تک نہ لی۔ [22]

(۲۔ جنگِ عظیم اوّل میں ملک گیری کی طمع)

یہاں تک کہ یہ جنگِ عظیم (اوّل 1914ء تا 1918ء) چھڑ گئی۔ اس کا واحد سبب طمع ملک گیری تھا۔ کچھ ایسے اسباب پیدا ہوگئے کہ ٹرکی کو بھی شریکِ جنگ ہونا پڑا۔ اور شریک بھی اُس فریق میں، جو برطانیہ سے برسرِ پیکار تھا۔ اس وقت تمام عالَم کے مسلمان جس مصیبت میں مبتلا ہوئے اور بالخصوص برطانوی حکومت میں رہنے والے مسلمانوں کو جو مشکلات پیش آئیں، اس کو خدائے علیم و حکیم ہی بہتر جانتا ہے۔ برطانوی مدبرین نے اپنی مسلمان رعایا کی تسلی کے لیے وقتاً فوقتاً چند اعلان شائع کیے، جن میں مسلمانوں کو اطمینان دلایا گیا کہ ان کے مقاماتِ مقدسہ پر کوئی آنچ نہ آئے گی اور مستقر (مرکز) خلافت پر کوئی معاندانہ قبضہ نہ کیا جائے گا۔ [23]

اگرچہ مسلمانوں کا ان وعدوں پر یقین کر کے مطمئن ہو جانا ایک سخت غلطی تھی، جس کا تلخ ترین مزا آج ان کے روحانی ذائقے کو تلخ بنا رہا ہے، لیکن واقعہ یوں ہی ہوا کہ مسلمان اس وعدے پر مطمئن ہوگئے اور سلطنتِ برطانیہ کی جانی و مالی امداد کر کے (اُس کی) شان دار فتح حاصل ہونے کا باعث بنے۔

(۳۔ برطانوی شاطرین کے مسلمانوں کے خلاف اقدامات)

شاطرینِ برطانیہ نے جیسے ہی ہوا کا رُخ اپنے موافق دیکھا، فوراً عیاری کے وار چلنے لگے اور تمام دنیا کی مہذب قوموں کی آنکھوں میں خاک ڈال کر تمام وعدے نسیاً منسیاً (بھولے بسرے) کر دیے۔ (چناں چہ انھوں نے):

(۱) مقاماتِ مقدسہ پر قبضہ کر لیا۔

(۲) مستقر خلافت یعنی قسطنطنیہ کو فوجی قبضے میں دبوچ لیا۔

(۳) سمرنا پر یونانیوں کو قبضہ دلا دیا۔

(۴) عرب کو ترغیب اور لالچ دے کر **خلیفۃُ المسلمین** سے باغی بنا دیا۔

(۵) ٹرکی فوجوں سے ہتھیار رکھوا لیے۔

(۶) اور اس غریب کو زمانۂ التوا میں بے دست و پا کر کے نہایت ذلت آمیز شرائطِ صلح پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا۔

(۷) شرائطِ صلح میں خاص طور سے اقتدارِ خلافت کو زائل کرنے والی شرطیں لگائی گئیں۔

(۸) اور تمام دیگر طاقتوں کی مسلمان رعایا کا **خلیفۃُ المسلمین** سے مذہبی سرپرستی کا تعلق منقطع کر دیا گیا۔

(۹) ولی عہد ٹرکی کو حراست میں کر لیا۔

(۱۰) اور اسی قسم کے ہزاروں غیر منصفانہ سلوک کیے گئے۔ [24]

(۴۔ عالَمِ اسلام کی مصیبت اور اضطراب)

ان لڑائیوں میں شام، عراق، عرب، سمرنا، ٹرکی کے مسلمانوں پر مصیبت کے پہاڑ توڑے گئے۔ لاکھوں مسلمان قتل کیے گئے۔ لاکھوں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوئے۔ ہزاروں کلمہ گو خانۂ ویران ہو کر وطن سے بھاگ نکلے اور آج غیر ملکوں میں، سڑکوں اور میدانوں پر بے یار و مددگار پڑے ہوئے ہیں۔ سینکڑوں کے بدن پر کپڑا اور جان بچانے کے لیے **قُوتِ لا یموت** (موت سے

بچانے والی خوراک) بھی میسر نہیں۔ سمرنا میں ہزاروں بے گناہ قتل کر دیے گئے۔ عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔

(ان اسباب کی وَجہ سے مسلمانوں کا ردّعمل)

یہ ہیں وہ روح فرسا و جاں سوز واقعات، جنھوں نے تمام عالَم کے مسلمانوں کو بے چین کر دیا ہے۔ اور جس کے دل میں ذرا سا ایمان بھی باقی ہے، وہ سیماب وار (پارے کی طرح) بے قرار ہے اور اپنا شرعی، اَخلاقی، قانونی حق سمجھتا ہے کہ اپنے مظلوم بھائیوں کی نصرت و اعانت کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ اور جس طرح ممکن ہو، اپنے بھائیوں کو دشمن کے نرغے سے نکالے اور ان کے پنجۂ ظلم سے نجات دلائے۔

(مسلمان بھائیوں کی اعانت کا فریضہ)

اخوتِ ایمانی کی ایک عالَم گیر لہر اُٹھی اور طَرفةُ العَین (آنکھ جھپکتے) میں مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک دوڑ گئی۔ سوتے ہوؤں کو بیدار کر دیا۔ بیداروں کو اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔ اور کھڑے ہوؤں کو بے محابا دوڑا دیا۔ حجرہ نشین زاہد، کتاب کے کیڑے طالبِ علم، دکانوں پر بیٹھنے والے تاجر، اسباب ڈھونے والے مزدور، مدرسوں میں درس دینے والے برق تقریر عالم، سب ایک صف میں آ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ دُوَلِ یورپ (یورپین حکومتوں) اور بالخصوص برطانیہ کی ظالمانہ اور غاصبانہ پالیسی کو دیکھ کر اکتیس کروڑ برادرانِ وطن (ہندو اور سکھ) بھی ان کے ساتھ ہمدردی کے لیے تیار ہو گئے۔

یہ فریضہ تو اپنے مسلمان بھائیوں کی اعانت اور امداد کے متعلق تھا۔ جن میں انسانی ہمدردی اور اَخلاقی مروّت کی وَجہ سے غیرمسلم بھائی بھی مسلمانوں کے دوش بہ دوش (کندھے سے کندھا ملا کر) کام کر رہے ہیں۔

(مقدس مقامات کا احترام باقی رکھنے کا فریضہ)

اس کے بعد دوسرا فریضہ حمایتِ مذہب اور اماکنِ مقدسہ کا احترام باقی رکھنے کے لیے ہے، جو مسلمانوں پر ان کے پاک مذہب نے عائد کیا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کی وہ آخری وصیت جو دنیا سے تشریف لے جاتے وقت مسلمانوں کو فرمائی تھی، یہ تھی:

''أخرجوا المشركين من جزيرة العرب.'' (25)

(مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔)

اور دوسری روایت میں ہے:

''أخرجوا اليهود و النّصارىٰ من جزيرة العرب.'' (26)

(یہود اور نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔)

ان احکام میں تمام مسلمان مخاطب ہیں۔ عرب و عجم کی کوئی تخصیص نہیں۔ شامی یا ترکی یا ہندی کا کوئی امتیاز نہیں۔

(حرمین شریفین کی عظمت و حرمت کی وجوہات)

ان احکام کی وَجہ یہ ہے کہ مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ اسلام کے اصلی سرچشمے ہیں۔ حجاز کی مقدس سرزمین پہلی جگہ ہے، جہاں سے توحیدِ ربّانی کا آفتاب طلوع ہوا اور اس کے ذرّوں کو روشن کر کے ہر ہر ذرّے کو دنیا کے مختلف حصوں کے لیے ایک ایک

www.rahimia.org

آفتاب بنا دیا۔

اس پاک اور مقدس سرزمین پر اسلام کے حقیقی جاں نثاروں اور خدائے پاک کی توحید پر جان قربان کرنے والوں کے خون کے محترم قطرے گرے ہیں اور انھوں نے نہایت جلیل القدر قربانیوں کے بعد ان مقامات کو کفر و شرک کی نجاست سے پاک کیا ہے۔

پس اس لیے کہ:

(۱) جزیرۂ عرب اسلام کا اصلی سرچشمہ ہے۔

(۲) آفتابِ توحید کا مَطلع (توحید کا سورج طلوع ہوا) ہے۔

(۳) اسلامی شوکت کا مرکز اور تجلّیاتِ الٰہی کا مَظہر ہے۔

(۴) اس میں خدا کے سب سے زیادہ مقدّس اور محبوب رسولؐ کی آرام گاہ ہے۔

(۵) اس میں دنیا کا سب سے پہلا توحید کا عبادت خانہ ہے۔

(۶) اس کے ریگستان کے ذرّے صحابہؓ کے خون سے سیراب کیے گئے ہیں۔

(۷) اس میں اسلام کے جدِّ اعلیٰ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی یادگاریں ہیں۔

ضروری ہے کہ وہ کسی غیر طاقت اور دشمن اسلام سلطنت کے قبضے اور تسلط سے پاک رہے۔

(دشمنانِ دین، حرمین شریفین کی بے حرمتی کا باعث ہیں)

کیا تین خدا ماننے والوں، کیا مادّی قوت کے پرستاروں، کیا دنیا کی تمام سرزمین کو اپنی جاگیر سمجھنے والوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کے تسلط اور قبضے کے بعد رسولِ پاکؐ کے روضۂ مطہّرہ کا احترام اور بیت اللہ الحرام کی حرمت باقی رہے گی؟ اور یہ دشمنانِ توحید اس کی تقدیس و تعظیم کو اپنے نقطۂ خیال سے ضروری سمجھیں گے؟

رعایا کے مذہبی جذبات سے خوف کھا کر اور عام ہیجان کے خطرے سے دفعتاً (فوری طور پر) کوئی ایسی بات نہ کریں گے، جس سے عالَمِ اسلامی میں ایک طوفان برپا ہوجائے تو یہ اَور بات ہے، لیکن کوئی تجربہ کار جسے یورپین طاقتوں کی اس مذہبی عصبیت کا تجربہ ہے، جس کی وَجہ سے برطانوی ذمہ دار اراکین (وزیرِاعظم انگلستان لائڈ جارج اور جنرل ایلن بائی) فتح بیت المقدس کو ''شان دار صلیبی فتح'' قرار دیتے ہیں اور سالونیکا پر یونانیوں کے قبضے کے وقت یہ کہہ کر خوشی مناتے ہیں کہ:

''یورپ میں عیسائی مذہب کے داخل ہونے کا پہلا دروازہ پھر عیسائیوں کے پاس آ گیا۔'' (27)

کوئی ایک منٹ کے لیے مطمئن نہیں ہوسکتا کہ ان دوست نما اعدائے (دشمنانِ) اسلام کے تسلط کے بعد بھی مقاماتِ مقدسہ کی حقیقی حرمت باقی رہ سکتی ہے۔

(آرام و آسائش سے حج ادا ہونے کے شبہ کا جواب)

بہت سے ظاہر بین مسلمان بھی اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ انگریزی تسلط کے بعد حج جاری رہے گا، بلکہ آرام و آسائش کے سامان زیادہ ہوجائیں گے۔

میں ان حضرات سے صرف اس قدر عرض کرتا ہوں کہ آپ نے ایک ظاہری سفرِ (حج) کو حقیقی حج سمجھ لیا ہے۔ اور ظاہری سفر

www.rahimia.org

کے آرام وآسائش کو حضورِ قلب اور اخلاص وحلاوتِ ایمانی کی جگہ دے دی ہے۔ اور پھر ظاہری آرام وآسائش کا بھی آپ کو تجربہ ہوجائے گا۔ ابھی ذرا ٹھہر جائیے! یہ سنہرا طوفان جو خود غرضی اور عیاری کے ساتھ عرب کی سطح پر محیط ہوگیا تھا، ذرا کھل جانے دیجیے، پھر آپ کو آرام وآسائش کا بھی پتا چل جائے گا۔

(شریفِ مکہ کے نام نہاد اسلامی اقتدار کا تجزیہ)

یہاں پر یہ کہا جاتا ہے کہ:

''حجاز پر انگریزی قبضہ نہیں ہے، بلکہ شریفِ مکہ کی حکومت ہے۔''

میں عرض کروں گا کہ (حجاز پر) حکومتِ شریف کی حقیقت بھی واقف کار نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے:

(الف) بھلا وہ ''شریف'' (حسین) جس نے اپنے قدیمی ولیٔ نعمت (انعامات عطا کرنے والے) اور واجب الاحترام آقا اور **مفروض الطّاعت خلیفة المسلمین** (مسلمانوں کے لیے جس خلیفہ کی اطاعت فرض تھی) سے ایک مسیحی طاقت (برطانیہ) کی ترغیب اور ابلہ فریبی (دھوکا کھانے کی بے وقوفی) کی وَجہ سے بغاوت کی ہو۔

(ب) وہ شریف جو انگلستان کا وظیفہ خوار ہو۔

(ج) وہ شریف جو مسیحی سرداروں کی تصویروں کو سینے سے لگاتا ہو۔

(د) وہ شریف جو خدا کے مقدس جائے امن (بیت اللہ الحرم) سے مسلمانوں کو گرفتار کر کے کفار کے حوالے کردے۔

اس کی حکومت صحیح معنی میں اسلامی حکومت ہوسکتی ہے؟ اور اس کا نام نہاد اقتدار، اسلامی اقتدار کہلا سکتا ہے؟

حاشا و کلاّ! (ہرگز ایسا نہیں، ہرگز نہیں)۔

(موجودہ دور میں مسلمانوں کے فرائض)

الغرض! بیت المقدس، حجاز کی مقدس سرزمین، عراق اور عرب، یہ سب مسلمانوں کے اماکنِ مقدسہ (مقاماتِ مقدسہ) ہیں۔ مستقرِ خلافت یعنی قسطنطنیہ اور ایڈریانوپل (Adrianople) قدیم اسلامی یادگاریں ہیں۔ ان تمام مقامات کو اسلامی شوکت و وقار کا مرکز اور خلافتِ اسلامیہ کا محور ہونے کی وَجہ سے مذہبی اَحکام کے بہ موجب (سبب سے)، غیر مسلم اثر سے پاک وصاف رکھنا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے۔

یہاں تک اس کا بیان تھا کہ اس وقت مسلمانوں کے مذہبی فرائض کیا ہیں؟

گزشتہ بیان سے معلوم ہوگیا کہ وہ فرائض یہ ہیں:

(۱) اپنے مسلمان مظلوم بھائیوں کی نصرت و اعانت (مدد اور تعاون)

(۲) مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت

(۳) **خلیفةُ المسلمین** (مسلمانوں کے خلیفہ) کے اقتدار کی برقراری میں کوشش (کرنا)۔

(۴) اور خلافتِ اسلامیہ کے استحکام کی سعی کرنا۔

www.rahimia.org

(ان فرائض کی واقعیت اور بعض لوگوں کے شبہات اور حیلے)

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ان فرائض کے ادا کرنے کی کیا سبیل (راہ) ہے؟

میں پہلے یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے، نہ صرف ہندوستان، بلکہ اقصائے عالم (دنیا کے دور دراز علاقوں) میں کوئی ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا، جو اِن فرائض کی واقعیت سے منکر ہو، بلکہ اس میں تردّد اور شبہ رکھنے والا بھی غالبًا کوئی متنفس (آدمی) نہ نکلے۔ یہی وَجہ ہے کہ ہندوستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ایک تلاطم برپا ہے۔ ہر شخص بے چین اور مضطرب ہے۔ خلافت کمیٹیوں کی کثرت اور عام قومی مظاہروں اور جلسوں کی نوعیت اس کی بیّن (واضح) دلیل ہے۔

مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں:

(الف) جو کسی خوف کی وَجہ سے جو اُن کے دلوں پر مسلط ہوگیا ہے، اس فریضے کے عائد ہونے میں طرح طرح کے شبہات نکالتے ہیں۔

(ب) یا کسی دُنیوی طمع اور لالچ اور اپنی سنہری رُوپہلی مصلحتوں کے باعث حیلے حوالے تراشتے ہیں۔

(علمائے ہند کا فیصلہ؛ دشمنوں سے معاشرتی اور اَخلاقی جنگ کی حالت)

آپ کو معلوم ہے کہ علمائے ہند کی ایک کثیر جماعت یہ فیصلہ کرچکی ہے کہ چوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس مدافعتِ اَعداء (دشمن کے مقابلے) کے مادّی اسباب نہیں ہیں۔ توپیں، ہوائی جہاز، بندوقیں ان کے ہاتھ میں نہیں۔ اس لیے مادی جنگ نہیں کرسکتے۔ لیکن انھیں یقین رکھنا چاہیے کہ جب تک برطانیہ کے وزرا اسلامی مطالبات تسلیم نہ کریں، اس وقت تک تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی ان کے ساتھ معاشرتی اور اَخلاقی جنگ کی حالت ہے۔ یعنی مسلمانوں پر حرام ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم رکھیں، جن سے ان کی مخالفانہ اور معاندانہ (دشمنی پر مبنی) طاقت کو مدد پہنچے اور ان کے نشۂ غرور و تکبر کو تیز کرے۔

(مسلمانوں کا اوّلین فرض؛ اپنے دشمن کو دشمن سمجھنا)

مسلمانوں کا اوّلین فرض ہے کہ وہ دشمنِ اسلام کو (اپنے) دشمن کے مرتبے میں رکھیں اور ایسے تعلقات کو — جو میل جول اور دوستی اور محبت پیدا کرنے والے ہیں — ایک دم چھوڑ دیں۔ اس اَخلاقی جنگ کا نام ''ترکِ موالات'' (عدمِ تعاون) ہے، جس کے متعلق قرآن پاک میں صریح احکام موجود ہیں۔ حق تعالیٰ نے سورتِ ممتحنہ میں فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ (28)

(اے مسلمانو! میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ۔)

اس آیت میں حضرت حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو دشمنانِ خدا اور دشمنانِ اہل اسلام کے ساتھ موالات (گہری دوستی اور تعاون) کرنے سے انکار فرمایا ہے۔

(اس آیت کے نزول کا پس منظر)

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ جس وقت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ فتح مکہ کا ارادہ کیا اور اس کا سامان ہونے لگا تو (حضرت) حاطبؓ بن ابی بلتعہ صحابی نے مشرکینِ عرب کو ایک خفیہ اطلاع کا خط لکھا، جس میں ان کو متنبہ کیا تھا کہ رسولِ خدا تمھارے اوپر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔تم اپنا بُرا بھلا سوچ لو۔ چوں کہ قریش کے ساتھ ان کا کوئی نسبی تعلق نہ تھا، اس لیے انھوں نے چاہا کہ ان کے ساتھ یہ احسان کردوں۔ اور اس کے بدلے میں وہ میرے اہل وعیال اور جائیداد وغیرہ کی — جو مکہ میں ہیں — حفاظت کریں۔حضورؐ کو وحی سے اس (خط) کی اطلاع ہوگئی اور راستے میں سے وہ خط پکڑا گیا۔اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

(ترکِ موالات کے حوالے سے قرآنی اصول)

اس (آیت) میں کئی باتیں خاص توجہ کے لائق ہیں:

(۱۔دشمن سے دشمنی رکھنے کا حکم)

اوّل یہ کہ اس میں حق تعالیٰ نے ''عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ'' [29] (میرے دشمن اور تمھارے دشمن) فرمایا ہے، جس سے صاف طور پر سمجھا جاتا ہے کہ دشمنانِ خدا اور دشمنانِ اہل اسلام سے ترکِ موالات (گہری دوستی کی ممانعت) کا حکم دینے کی علت (سبب) ان کی عداوت اور دشمنی ہے۔تو جہاں کہیں عداوت اور دشمنی موجود ہوگی، وہاں ترکِ موالات کا حکم اسی طرح عائد ہوگا، جس طرح آیتِ شریفہ کے نزول کے واقعے میں ہوا تھا۔

(۲۔ دنیاوی مصلحت کی وَجہ سے دشمن سے دوستی رکھنے کی ممانعت)

دوسرے یہ کہ (حضرت) حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے کفار کی محبت یا قلبی میلان یا ان کے کفر سے راضی ہونے کی وَجہ سے یہ کام نہ کیا تھا، بلکہ محض ایک دُنیوی مصلحت کی وَجہ سے (یہ کام) کیا تھا اور مصلحت بھی ایسی کہ ان کے اہل وعیال کی حفاظت کی کوئی سبیل (راہ) نہ تھی۔ کیوں کہ وہ دشمنوں کے تسلط کے مقام میں تھے۔گویا ان کا یہ خبر دینا دشمنوں کی ایک خدمت کا (جائیداد واہل و عیال کی حفاظت کی صورت میں) معاوضہ تھا۔ باوجود اس کے حضرت حق نے اس کو موالات (گہری دوستی) سے تعبیر فرمایا اور (اس سے) ممانعت کا حکم بھیجا۔

(۳۔دشمن کو مسلمانوں کی حالت کی خبر دینے کی ممانعت)

تیسرے یہ کہ (حضرت) حاطبؓ کا یہ فعل؛ یعنی: خبر دینا' کفار کی کوئی مادّی مدد کرنا نہ تھا، بلکہ صرف ان کو ان کے بُرے انجام سے خبردار کرنا اور اپنی نجات کا طریقہ سوچ لینے کے لیے ہلاکت کا وقت سر پر آنے سے پہلے موقع بہم پہنچانا تھا،مگر صرف اتنی بات کو بھی حق تعالیٰ نے موالاتِ ممنوع (ممنوعہ گہری دوستی اور تعاون) میں داخل فرما کر موالات کی ممانعت کا حکم نازل فرمایا۔

حضرت حاطبؓ کے اس خفیہ خط کے یہ الفاظ اس مضمون پر پوری روشنی ڈالتے ہیں:

''إنّ رسولَ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم يريدكم فخذوا حذركم.'' [30]

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمھارے اوپر حملے کا ارادہ فرما رہے ہیں۔ تم اپنا بچاؤ اختیار کرو۔)

اور جب حضورؐ نے ان سے دریافت کیا کہ کیوں صاحب! یہ کیا حرکت تھی؟

تو انھوں نے جواب دیا:

''و ما فعلتهُ كفراً، و لا ارتداداً من ديني، و لا رِضاً بالكُفر بعد الإسلام.'' (31)

(حضورؐ! میں نے یہ کام کفر کی وَجہ سے، یا اسلام سے پھر جانے کے باعث، یا اسلام لانے کے بعد کفر سے راضی ہونے کے سبب سے نہیں کیا۔)

(بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ)

''كان أهلي بين ظهرانيهم فخشيتُ علىٰ أهلي فأردتُّ أن اتّخذ لي عندهم يداً. و قد علمتُ أنّ اللّٰه تعالىٰ ينزل بهم بأسهُ، و أنّ كتابي لا يغني عنهم شيئاً.'' (32)

(میرے اہل و عیال کفارِ مکہ کے نرغے میں تھے۔ مجھے ان کی جان کا خوف تھا۔ پس میں نے چاہا کہ ان کے ساتھ ایک احسان کردوں۔ اور بے شک میں جانتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ ان کافروں پر اپنا عذاب نازل کرے گا اور میرے خط سے انھیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔)

(۴۔ دشمن کی مدد اور تعاون کرنے کی ممانعت)

چوتھے یہ کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے (حضرت) حاطبؓ کے اس فعل کو ''**نکثِ بیعت**'' (بیعت توڑنا) اور ''**مظاھرت**'' (دشمن کی مدد) سے تعبیر فرمایا۔ (حضرت عمر فاروقؓ کے الفاظ ہیں:)

''لكنّهُ قد نكث، و ظاهر أعدائك عليك.'' (33)

(یا رسول اللہ! اس حاطب نے اسلام کی بیعت توڑ دی اور آپؐ کے خلاف آپؐ کے دشمنوں کی مدد کی۔)

(کافروں سے گہری دوستی کی ممانعت کے قرآنی اصول)

اس (آیت) کے بعد حضرت حق تعالیٰ شانہٗ ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝٩ (34)

(یعنی حق تعالیٰ تم کو ایسے لوگوں کی موالات (گہری دوستی اور تعاون) سے منع کرتا ہے، جو تم سے مذہبی لڑائی لڑیں۔ اور تم کو تمھارے گھروں سے نکالا اور نکالنے والوں کے مددگار ہوئے۔ اور جو لوگ ان سے ترکِ موالات نہ کریں گے، وہ ظالم ہیں۔)

جن کافروں میں یہ تین چیزیں پائی جائیں، ان کی موالات (گہری دوستی) کو یہ آیت حرام قرار دیتی ہے: (35)

۱۔ مسلمانوں سے دینی لڑائی۔

۲۔ مسلمانوں کو گھروں سے نکالنا اور خانہ ویران کرنا۔

۳۔ نکالنے والوں کی مدد کرنا۔

(1۔ برطانیہ کی مسلمانوں سے دینی لڑائی)

پہلی بات کہ برطانیہ کی مسلمانوں سے لڑائی مذہبی تھی یا نہیں؟ برطانیہ کے وزیر اعظم (لائڈ جارج) کے ان الفاظ سے —— جو جرنیل ایلن بائی (Gen. Edmund Henry Hynman Allenby) کو فتح بیت المقدس کی مبارک باد دیتے وقت کہے گئے تھے اور اس فتح کو ''شان دار صلیبی فتح'' قرار دیا گیا تھا —— صاف ظاہر ہے۔ اور ٹرکی کے ساتھ التوائے جنگ اور صلح کی (درجِ ذیل) شرائط پر نظر ڈالنے سے موٹی نظر والے کو بھی حقیقتِ حال نظر آ جاتی ہے:

(i) تھریس پر یونانیوں کو قبضہ دلانا،

(ii) قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینا، اپنے صریح و صاف وعدوں کی خلاف ورزی کرنا،

(iii) سمرنا میں یونانیوں کے مظالم کو نہ روکنا،

یہ تمام چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے بعد کسی کو اس بات میں شبہ باقی نہیں رہ سکتا کہ ترکوں کے ساتھ صرف ان کے مسلمان ہونے کی وَجہ سے یہ تمام ناانصافیاں روا رکھی گئی ہیں۔

(2۔ برطانیہ کا مسلمانوں کو گھروں سے نکالنا اور مہاجر بنانا)

دوسری بات ''مسلمانوں کو گھروں سے نکالنا''۔ قسطنطنیہ اور اس کے اَطراف سے ہزاروں محبانِ وطن نکل بھاگے۔ خود ولی عہدِ سلطنت نے اسلامی حمیّت کی وَجہ سے کئی مرتبہ نکلنے کا ارادہ کیا، مگر ان کو سخت حراست میں کر دیا گیا۔ یونانیوں کے مظالم سے ہزاروں مسلمان سمرنا سے گھر بار چھوڑ کر بھاگے۔ قسطنطنیہ سے بہت سے معززین اور مقتدر حضرات کو جلاوطن کر کے مالٹا وغیرہ میں بھیج دیا گیا۔ یہ تمام واقعات ہیں، جس سے اِخراج من الدِّیار (گھروں سے نکالنا) ثابت ہے۔

(3۔ برطانیہ کا مسلمانوں کو مہاجر بنانے والوں کی مدد کرنا)

(اور تیسری بات' برطانیہ کی طرف سے) مظاهرات علیٰ الإخراج (نکالنے والوں کی مدد کرنے) میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ مالٹا میں ٹرکی کے بہت سے مقتدر افراد سے میری ملاقات ہوئی، جو وہاں نظر بند تھے۔

(ان تینوں امور کی وجہ سے برطانیہ سے گہری دوستی حرام ہے)

پس جب کہ یہ تینوں باتیں سلطنتِ برطانیہ کے ذمہ دار وزرا (اراکین وفوجی افسران) کی طرف سے واقع ہوگئیں تو اب بھی کسی مسلمان کو برطانیہ کے ساتھ موالات کے حرام ہونے میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟

(موالات اور معاملات کے فرق پر مبنی شبہ کا جواب)

رہا یہ شبہ کہ ''موالات'' اَور چیز ہے اور ''معاملہ'' اَور چیز ہے۔ آیت ''موالات'' کو منع کرتی ہے، نہ کہ ''معاملات'' کو۔ تو میں کہوں گا کہ ہاں ''موالات'' اور ''معاملہ'' میں مفہوم کے لحاظ سے فرق ہے، لیکن موالات کے مفہوم میں قربت اور نزدیکی پیدا

کرنے والے تعلقات اور باہمی نصرت و معاونت کے تمام ارتباطات (باہمی روابط) لغوی معنی کے لحاظ سے داخل ہیں۔ پس تمام:

(۱) ایسے معاملے جن کی وَجہ سے دشمن کے ساتھ میل جول، ربط و اتحاد بڑھے۔

(۲) ایسے معاملے جو اُن کی معاندانہ طاقت کو بڑھائیں۔

(۳) ایسے تعلقات (فوجی ملازمت وغیرہ) جو مسلمانوں کی ہلاکت اور شوکتِ اسلامیہ کے مٹانے میں دخل رکھتے ہوں۔

(۴) ایسے روابط جن کی وَجہ سے انھیں موقع ملے کہ مسلمانوں کی رضامندی پر استدلال کر سکیں۔

(۵) ایسے مراسم جن سے ان کے ساتھ محبت اور اُلفت کا اظہار ہوتا ہے۔

براہِ راست یا بالواسطہ ممنوع محرّمہ (حرام کیے گئے ممنوعہ اُمور) میں داخل ہیں۔

(حضرت) حاطبؓ بن ابی بلتعہ کے واقعے کو بہ غور دیکھا جائے اور فاروقِ اعظمؓ کی ایمانی عینک سے مشاہدہ کیا جائے تو پھر کوئی شبہ واقع نہیں ہوسکتا۔ اس کی تفصیل کا یہ وقت نہیں ہے۔ اس لیے صرف اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں۔

(مسلمانوں کے نقصان کے شبہ کا جواب)

دوسرا شبہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان (برطانوی حکومت سے) ترکِ موالات (عدمِ تعاون) سے تکلیف اور نقصان اٹھائیں گے۔ اس کے جواب میں بھی مختصراً یہ واقعہ ذکر کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ جس وقت یہود بنوقینقاع سے مسلمانوں کی لڑائی ہوئی تو (حضرت) عُبادہ بن الصامت انصاریؓ نے عرض کیا:

''فقال عُبادة: إنّ لی أولیاء من الیهود کثیر عددهم، شدیدة شوکتهم، و إنّی أبرأ إلیٰ اللّٰه و رسوله من ولایتهم و حلفهم، و لا مولیٰ لی إلّا اللّٰه و رسوله.

فقال عبداللّٰه ابن اُبیّ: لٰکنّی لا أبراءُ من ولایة الیهود، فإن أخاف الدّوائر ولا بُدّ لی منهم.'' (36)

(حضور! میری یہود کی ایسی جماعت سے موالات تھی، جن کی تعداد بہت ہے اور طاقت زبردست ہے۔ آج میں ان کی موالات سے دست برداری کا اعلان کرتا ہوں اور اب خدا اور رسول کے سوا میرا کوئی مولیٰ نہیں۔

اس پر عبداللہ بن اُبیّ (رئیس المنافقین) بولا: میں تو یہود کی موالات سے دست برداری نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ مجھے مشکلات کا ڈر ہے۔ میری تو بغیر ان کے گزر مشکل ہے۔)

اس پر آیت نازل ہوئی:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ (37)

(اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔)

اور منافقین کا یہ قول کہ ''ہمیں تکالیف اور مصیبتیں پہنچنے کا خوف ہے''، جوازِ موالات (گہری دوستی کے جواز) کے لیے کافی نہ ہوا۔ اور ان کو موالات کی اجازت نہ دی گئی، بلکہ ایسے لوگوں کے بارے میں حضرت تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (تُو دیکھے گا ان کے دلوں میں مرض ہے۔)

www.rahimia.org

اور ان کے اس قول کا کہ:

يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَاۗىِٕرَةٌ ۭ (ہمیں تکلیفیں اور مصیبتیں پہنچنے کا خوف ہے۔)

یہ جواب دیا کہ:

فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ (38)

(عن قریب حق تعالیٰ اپنی طرف سے مسلمانوں کو فتح یا اَور کوئی مہتمّ بالشان امر ظاہر کرے گا۔ جس سے یہ تمام ڈرنے والے اپنے نفسانی منصوبوں پر نادم ہوں گے۔)

(آج بھی میدانِ عمل تمھارے سامنے ہے)

آج بھی ایک میدانِ عمل تمھارے سامنے ہے۔ ابتلا و امتحان کی کڑی منزل درپیش ہے، مگر آپ ڈر نہ جائیں۔ صرف اپنے آقائے نامدار اور خاتم النّبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پر غور کریں۔

(آزمائش کی اس گھڑی میں اُسوۂ نبوی کو سامنے رکھیں)

آپؐ کو مشرکین عرب نے اس قدر سخت تکلیفیں پہنچائی ہیں کہ الأمان، الحفیظ! مگر آپؐ ان تمام جاں گداز تکلیفوں کو نہایت استقامت کے ساتھ برداشت کرتے رہے اور اپنے فرضِ تبلیغ کو جاری رکھا۔ یہاں تک کہ کفارِ مکہ نے آپؐ کے قتل کا منصوبہ باندھ کر آپؐ کے مکان کا محاصرہ کرلیا۔ اس وقت آپؐ خدائے تعالیٰ کے حکم سے مکان چھوڑ کر تشریف لے گئے اور تین دن غارِ ثور میں رہ کر مدینہ منورہ چلے گئے۔ وہ زمانہ مسلمانوں کے لیے سخت ابتلا و آزمائش کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں کی تعداد نہایت قلیل اور مالی حالت نہایت تنگی کی تھی، مگر ان کے ایمان پختہ اور قلب مطمئن تھے۔ ان کی صداقت اور استقامت کی برکت تھی کہ کفار کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے اور ذلیل و خوار ہوکر مغلوب ہوئے اور خدا کا نور تمام دنیا میں پھیل گیا۔

(ایمان کی پختگی اور صبر و استقامت سے کامیابی یقینی ہے)

میری غرض صرف اس بیان سے یہ ہے کہ اگر آج مسلمانوں کے ایمان پختہ ہوجائیں اور خدا تعالیٰ کے وعدۂ نصرت:

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (39)

(اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی)

پر اُن کو پورا بھروسا ہوجائے اور تکالیف کے برداشت میں ذرا صبر و استقامت سے کام لیں تو اُن کی کامیابی یقینی ہے۔ کیوں کہ آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد چالیس کروڑ ہے، جس میں صرف ہندوستان میں سات ساڑھے سات کروڑ آباد ہیں۔ اگر یہ سب متفقہ طور پر اسلامی خدمت کے لیے صبر و استقامت کی ڈھال لے کر کھڑے ہوجائیں تو کیا کوئی طاقت ہے جو توحید کی بجلی پر غالب آجائے؟!

دشمنانِ خدا ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی کوشش کرتے رہے ہیں، لیکن خدائے تعالیٰ کی نصرت اور توفیق سے مؤمنین کی قوتِ ایمانی اور استقامت ہمیشہ ان کی کوششوں کے سامنے سدِ سکندری (مضبوط دیوار) ثابت ہوئی ہے۔

اسلام خدا کا نور ہے، جو اُن کور چشموں (اندھوں) کی معاندانہ پھونک سے کبھی نہیں بجھ سکتا۔

(آج تمھارے ایمان و اخلاص کا امتحان ہے)

فرزندانِ توحید! آج تمھارے ایمان و اخلاص کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ خدا تعالیٰ دیکھ رہا ہے کہ کون اس کے جلال و جبروت کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ اور کون ہے، جو دنیا کی ناپائیدار ہستیوں کے خوف سے خدا کی امانت میں خیانت کرتا ہے۔

اگر تم کو میدانِ محشر میں خدا کے سامنے پیش ہونا ہے، اگر تم کو رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی آرزو ہے تو اُس کے پاک دین کی حفاظت کرو۔ اس کے مقدس احکامات کی اطاعت کرو۔ اس کی امانتِ توحید کو برباد نہ ہونے دو اور اُس کی دی ہوئی عزت کو حقیقی عزت سمجھو۔

(اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک مکمل نظام ہے)

اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ تمام مذہبی، تمدنی، اَخلاقی، سیاسی ضرورتوں کے متعلق ایک کامل اور مکمل نظام رکھتا ہے۔ جو لوگ کہ زمانۂ موجودہ کی کشمکش میں حصہ لینے سے کنارہ کشی کرتے ہیں اور صرف حجروں میں بیٹھے رہنے کو اسلامی فرائض کی ادائیگی کے لیے کافی سمجھتے ہیں، وہ اسلام کے پاک وصاف دامن پر ایک بدنما دھبہ لگاتے ہیں۔ ان کے فرائض صرف نماز، روزہ میں منحصر نہیں، بلکہ ان کے ساتھ ہی اسلام کی عزت برقرار رکھنے اور اسلامی شوکت کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوتی ہے۔

وفّقنا اللّٰہ و إیّاکم لِما یُحبُّ و یرضیٰ.

(اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں اپنے محبت و رضامندی کے کاموں کی توفیق عطا فرمائے۔)

(ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت)

برادرانِ وطن (ہندوؤں) نے تمھاری اس مصیبت میں جس قدر تمھارے ساتھ ہمدردی کی ہے اور کر رہے ہیں، وہ ان کی اَخلاقی مروّت اور انسانی شرافت کی دلیل ہے۔ اسلام احسان کا بدلہ احسان قرار دیتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ احسان اس کا نام ہے کہ آپ اپنی چیز کسی کو دے دیں۔ کسی دوسرے کی چیز اُٹھا کر دینے کو 'احسان' نہیں کہتے۔ پس آپ برادرانِ وطن کے احسان کے بدلے میں وہی کام کر سکتے ہیں، جو اَخلاقی اور شریفانہ طور سے اپنے اختیارات سے کر سکتے ہیں۔ مذہبی احکام خدا کی امانت ہیں۔ ان پر تمھارا اختیار نہیں۔ اس لیے لازم ہے کہ حدودِ مذہب کے اندر رہ کر تم احسان کے بدلے میں احسان کرو۔ اور دونوں قومیں مل کر ایسے زبردست دشمن (برطانیہ) کے مقابلے کے لیے کھڑے ہو جاؤ، جو تمھارے ملک میں تمھاری آزادی کو پامال کر رہا ہے۔

(جماعتِ علما کے فرائض اور ذمہ داریاں)

جماعتِ علما جو حقیقتاً مسلمان کے مذہبی قائد ہیں، ان کا فرض ہے کہ:

(ا۔ اس موقع کی نزاکت سمجھیں)

اس وقت موقع کی نزاکت اور اہمیت کو نظر انداز نہ کریں۔

www.rahimia.org

(۲۔علمی اختلاف سے بچیں)

آپس کے نزاع اور اختلاف میں پڑ کر اصل مقصد کو خراب نہ کریں۔ ورنہ مسلمانوں کی خرابی اور بربادی کی تمام ذمہ داری انھیں پر عائد ہوگی۔

(۳۔دینی غلبے کے اس کام کو اہمیت دیں)

علمی تدقیقات (علمی و قانونی باریکیوں) کے لیے آپ کے واسطے بہت سے میدان کھلے ہوئے ہیں۔ عبادت اور ریاضت کے لیے بہت سی راتیں بلاشرکتِ غیرے آپ کو حاصل ہیں، مگر جو کام کہ (غزوۂ احد اور بدر کے موقع پر) جبلِ اُحد اور میدانِ بدر میں ہوا، وہ مسجدِ نبویؐ جیسی مقدس جگہ کے مناسب نہ تھا۔

(۴۔احتجاج اور مطالبہ حقوق کی جدوجہد کریں)

آج احتجاج اور مطالبۂ حقوق کے میدان، صرف مظاہروں کے پلیٹ فارم ہیں۔ خلوتیں اور تنہائی کی راتیں اس کے لیے کافی نہیں ہیں کہ اگر موجودہ زمانے میں توپ اور بندوق اور ہوائی جہاز کا استعمال مدافعتِ اعدا (دشمن کے مقابلے) کے لیے جائز ہوسکتا ہے، باوجود یہ کہ قرونِ اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں کبھی تأمل نہ ہوگا۔ کیوں کہ موجودہ زمانے میں ایسے لوگوں کے لیے — کہ جن کے ہاتھ میں توپ اور بندوق اور ہوائی جہاز نہیں — یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔

(۵۔ مذہبی امور میں حکومت کی مداخلت کو بند کرائیں)

معزز حاضرین! برطانیہ کا یہ دعویٰ کہ:

''وہ کسی کے مذہبی اُمور میں مداخلت نہیں کرتی۔''

آپ ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں، مگر میں پوچھتا ہوں کہ:

(الف) کیا ہندوستان کے مسلمان اپنے مذہبی اُمور میں آزادی کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں؟

(ب) کیا سلطنت کا زبردست پنجہ ان کا گلا گھونٹنے کے لیے ہر وقت تیار نہیں؟

(ج) آج مولوی ظفر علی خاں [40] اور مولوی لقاء اللہ (پانی پتی) [41]، صوفی اقبال احمد [42]، مولوی محمد فاخر (الٰہ آبادی) [43] اور اسی طرح دوسرے فرزندانِ ہند کس جرم میں قید خانوں میں بند ہیں؟

(د) کیا انھوں نے مذہبی احکام کی تبلیغ کے سوا اَور کوئی گناہ کیا تھا؟

(ہ) کیا مسلمانوں کے مذہبی احکام کے فتوے ضبط نہیں ہوئے؟

(و) کیا مسلمانوں کی ہزاروں خواتین اپنے نکاح و طلاق کے مقدمات میں غیر مسلم عدالتوں کے سامنے جا کر اسلامی احکامِ شریعت کے خلاف فیصلہ کرانے پر مجبور نہیں؟

(ز) کیا شفعہ و قبضۂ مخالفانہ وغیرہ کے قوانین [44] شریعتِ اسلامیہ کے موافق ہیں؟

www.rahimia.org

یہ تمام چیزیں ہیں، جن کی پوری نگہداشت جمعیت علما کے اہم فرائض میں سے ہے۔

(٦۔اسلامی تعلیم کا بہتر اور مفید نظام بنائیں)

اسی طرح اسلامی، مذہبی تعلیم کے لیے مفید نظام قائم کرنا اور تمام اسلامی درس گاہوں کو ایک سلسلے میں منسلک کرنا بھی علما کے ضروری فرائض میں داخل ہے۔

(٧۔اسلامی اوقاف کے صحیح استعمال کا نظم بنائیں)

اسلامی اوقاف کا وسیع وعریض سلسلہ بھی ایک خاص نظم کا محتاج ہے۔

غرض کہ بہت سی اسلامی ضروریات ہیں، جو علما کے ایک مرکز پر جمع نہ ہونے کی وَجہ سے منتشر حالت میں تھیں۔ خدا تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ اس نے اپنی رحمت سے ان کو جمع کر دیا۔ (علمائے ہند کے) اس اجتماع کی بدولت امید ہے کہ تمام پراگندہ اور منتشر اُمور کا نظام درست ہو جائے گا۔

(خدا پر بھروسہ اور ان فرائض کی ادائیگی کا عہد کریں)

قبل اس کے کہ میں اپنے بیان کو ختم کروں، آپ حضرات (علمائے کرام) سے ایک التجا کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ:

(١) ہر حال میں خدائے قدوس پر بھروسہ رکھیں۔

(٢) اور اپنی تدبیر کو تدبیر ہی کے مرتبے میں سمجھیں۔

(٣) اسلامی احکام کی تعمیل کریں۔

(٤) اور مذہبی فرائض ادا کرنے کا مضبوط اور مستحکم عہد باندھ لیں۔

خدا کی رحمت نیک بندوں کے ساتھ رہتی ہے اور اس کا رحم ضعیفوں اور خدا پر بھروسہ رکھنے والوں کی مدد کرتا ہے۔

(ربّ العالمین کے حضور دعائیہ کلمات)

اے زندہ وقدوس خدا! اے ارحم الراحمین! اے شہنشاہ ربّ! ربُّ العالمین! ہمارے گناہوں سے درگزر فرما اور ہمارے ضعف و ناتوانی پر رحم کر۔ اعمالِ صالحہ کی توفیق دے اور اپنے دین کی خدمت کے لیے ہمارے دل مضبوط کر دے۔ ہماری کلائیوں (بازوؤں) میں طاقت عنایت فرما۔ ہمارے اور اپنے دشمنوں کو ہلاک کر۔ حق کو فتح اور باطل کو شکست دے۔

آمین یا أرحم الرّاحمین.

و آخر دعوانا أن الحمد للّٰہ ربّ العالمین. و الصّلوٰۃ و السّلام علیٰ رسولہٖ محمّد و آلہٖ و أصحابہٖ أجمعین. (45)

ہدایات اور نصائح؛ حضرت شیخ الہندؒ کا آخری بیان

پیش کردہ: اختتامی اجلاس منعقدہ مؤرخہ 21/نومبر 1920ء

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

الحمد للّٰہ و سلام علٰی عبادہ الّذین اصطفٰی. أمّا بعد!

حضرات علمائے کرام، حضّارِ جلسہ! میں:

(1۔ جمعیت کی کارروائیوں پر اظہارِ تشکر)

اوّلاً جمعیت کی تمام کارروائیوں کے بہ احسن اُسلوب انجام پانے پر خدائے قادر و توانا کا شکر ادا کرتا ہوں۔

(2۔ سیاسی شعبے میں علما کی جدو جہد پر اظہارِ مسرت)

اور ثانیاً یہ عرض ہے اگر چہ میں ناقابلِ انکار عذر کی وجہ سے آپ کے جلسوں کی شرکت سے بہ ظاہر محروم رہا، لیکن آپ یقین کیجیے کہ میرا دل آپ کے مجمع سے بہت کم غائب ہوا ہے۔ مجھے یہ معلوم ہو کر نہایت مسرت ہوئی کہ جسمِ قوم کی روح (جماعتِ علما) نے بعض اِن **شُعَبِ سیاسیہ** (سیاسی شعبوں) میں پھر ایک مرتبہ اپنی زندگی کا ثبوت پیش کیا ہے، جن میں وہ بالکل مردہ سمجھی جا رہی تھی۔ اور جن میں اگر وہ مردہ ثابت رہتی تو اسلامی عزت و وقار کا بالکل ہی خاتمہ تھا۔

(3۔ علما کے لیے گرمیٔ محفل کی تقریریں اور بیانات کافی نہیں)

آپ رنجیدہ نہ ہوں تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا علم و تدیُّن اگر اب بھی عالمِ اسلامی کے خوف ناک مصائب سے آنکھ بند رکھنے کی اجازت دیتا تو آج دنیا ہماری غیرتِ ایمانی اور شرافتِ انسانی دونوں کے بہ یک وقت دفن کیے جانے پر ماتم کناں ہوتی۔ اور اب بھی اگر ہم چند تجاویز پاس کر کے اور صرف چند ساعتوں کی گرمیٔ محفل کو اپنی تمام تقریروں اور خطبوں کا **ماحصل** (خلاصہ اور نتیجہ) سمجھ کر منتشر ہو گئے تو ہماری مثال ٹھیک اس مریض کی سی ہوگی، جو ایک اکسیرِ شفا کی تکرار زبان سے بار بار کرتا رہے، لیکن اس کا استعمال ایک دفعہ بھی نہ کرے۔

(4۔ میرے محسوسات اور مقاصد میرے خطبے سے بہ خوبی واضح ہیں)

میں اس وقت آپ سے رخصت ہو رہا ہوں اور جو کچھ مجھے کہنا تھا، (اپنے) خطبہ صدارت میں کہہ چکا ہوں اور مبسوط مضمون، جو مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی نے آپ کو آج ہی کے اجلاس میں سنایا ہے۔ اس کے ضمن میں بھی میرے مقاصد اور محسوسات نہایت خوبی سے ادا ہو گئے ہیں اور حضرات علمائے متدیّنین (دینی فہم و شعور رکھنے والے علما) نے بحث و تمحیص کے بعد جو امور طے کیے ہیں، ان سے بھی یہ بندۂ ضعیف عملاً علاحدہ نہیں ہے۔ اس لیے اب مجھ کو اس سے زائد کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(5۔ طے کردہ تجاویز پر عمل درآمد بہت ضروری ہے)

(اب) ہم سب کومل کر متوکّلاً علیٰ اللّٰہ (اللہ پر توکل کرتے ہوئے) ان طے شدہ تجاویز پر عمل کرنا اور کرانا چاہیے، جن سے ہمارے ایمان، ہمارے کعبہ، ہماری خلافت، ہماری عزت وآبرو اور ہمارے مقاماتِ مقدسہ اور ہمارے وطنی اور قومی حقوق کا تحفظ ہوسکتا ہے۔ اگر اس وقت بھی ہم نے غفلت اور تن آسانی اختیار کی تو شاید عافیت حاصل کرنے کا یہ آخری موقع ہوگا، جس کو ہم جان بوجھ کر اپنے ہاتھ سے کھوئیں گے۔ جو صراطِ مستقیم آپ نے معلوم کرلیا ہے، قرآن وسنت کی روشنی میں اس پر سیدھے چلے جایئے اور یمین وشمال (دائیں بائیں) کی طرف مطلق التفات (توجہ) نہ کیجیے۔

اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ (46)

(میرے اس سیدھے راستے کی اتباع کرو اور راستے سے نہ ہٹو، تاکہ تم سیدھی راہ سے بھٹک نہ جاؤ۔)

(6۔ دیگر لوگوں کو حکمت وشعور سے اپنی جماعت میں جذب کیجیے)

جو لوگ اس وقت آپ سے علاحدہ ہیں، ان کو بھی ''حِکمت'' اور ''موعظۃِ حسنہ'' (اچھی نصیحت) سے اپنی جماعت کے اندر جذب کیجیے۔ اگر اس میں مجادلہ (باہمی مباحثہ اور مکالمے) کی نوبت آئے تو بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ (47) (وہ احسن طریقے سے) ہونا چاہیے۔

(7۔ اس خطے کی تمام اقوام کا اتفاق واجماع بہت مفید ہے)

کچھ شبہ نہیں ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کی ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر تعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے۔ میں ان دونوں قوموں کے اتفاق واجتماع کو بہت ہی مفید اور منتج (نتیجہ خیز) سمجھتا ہوں۔ اور حالات کی نزاکت کو محسوس کرکے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد (رہنماؤں) نے کی ہے اور کر رہے ہیں، اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ صورتِ حال اگر اس کے خلاف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو آئندہ ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بہ روز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا۔ اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر (مسلمان اور ہندو)، بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں اگر صلح وآشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم (انگریز) — خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقت ور ہو — ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر واستبداد سے شکست دے سکے گی۔

(8۔ اس اتفاق واتحاد کی حدود وقیود کا لحاظ رکھنا ضروری ہے)

ہاں! یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں، آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت وآشتی کو اگر آپ خوش گوار اور پائیدار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دل نشین کرلیجیے۔ اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی (مقرر کردہ) حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے۔ جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ:

www.rahimia.org

(الف) اس صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے۔

(ب) اور دُنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے، جس سے کسی ایک فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے:

(الف) مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں۔

(ب) لیکن محکموں اور ابوابِ معاش (معاشی معاملات) میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔

(9۔محض جلسوں میں ہاتھ اٹھانے اور قراردادوں کی تائید سے دھوکا نہ کھائیں)

میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں، بلکہ میری یہ گزارش دونوں قوموں کے زعما (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیوشنوں (resolutions) (قراردادوں) کی زبانی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے۔ ان (رہنماؤں) کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصّبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔

اگر فرض کرو ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیے، یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے اتفاق کے لیے مہلک نہیں، البتہ ان دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائیاں اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں، اتفاق کے حق میں سم قاتل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورے کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔ (48)

(10۔ نیکی، سمجھ، ثابت قدمی اور صبر و استقلال کے لیے دعائیہ کلمات)

اب آخر میں دعا کرتا ہوں کہ:

(الف) اللہ جل شانہٗ ہم کو اور آپ کو نیکی اور سمجھ دے۔

(ب) اور ہمارے دلوں کو سیدھا کرنے کے بعد کج نہ کرے۔

(ج) اور ہماری وجہ سے ہمارے مذہب پر دوسروں کو تضحیک کا موقع نہ دے۔

(د) اور ہم کو ہر ایک آسان اور کٹھن منزل میں صبر و استقلال کے ساتھ ثابت قدم رکھے۔

(ہ) اور اس وقت کے حالات سے بہتر حالات میں پھر ہم کو جمع کرے۔

آمین یا ربّ العالمین، و صلّی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ محمّد،
و علیٰ آلہٖ و صحبہٖ أجمعین، برحمتک یا أرحم الرّاحمین.

آپ کا دعا گو اور خیر اندیش
محمود حسن غفرلہٗ

۹ ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ/ ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء (49)

حوالہ جات و حواشی

1۔ حضرت شیخ الہندؒ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا نقل کی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو تہجد کے لے اٹھتے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔''

(رواہ البخاری، کتاب التّھجّد، باب التّھجّد باللّیل، حدیث نمبر 1120)

2۔ القرآن 159:3۔

3۔ القرآن 38:42۔

4۔ القرآن 9:58۔

5۔ القرآن 159:3۔

6۔ القرآن 9:58۔

7۔ القرآن 10:49۔

8۔ عن محمّد بن کعب القرظی، کنز العُمّال، حدیث نمبر 707، الجامع فی الحدیث لابن وھب، حدیث نمبر 208 ۔

9۔ أخرجۂ مسلم فی کتاب البرّ و الصّلة. باب تراحم المؤمنین و تعاطفھم، حدیث نمبر 2586. و أخرجۂ الخطیب فی مشکوٰة المصابیح، حدیث نمبر 4954۔

10۔ اخرجۂ البخاری فی کتاب المظالم و الغضب، باب لا یظلم المسلم المسلم، حدیث نمبر 2442. و اخرجۂ المسلم فی کتاب البرّ و الصّلة، باب تحریم الظلم، حدیث نمبر 2580. مشکوٰة، حدیث نمبر 4958.

11۔ رواہ مسلم فی کتاب البرّ و الصّلة، باب تحریم الظّلم، حدیث 2564. مشکوٰة، حدیث 4959.

12۔ رواہ ابوداؤد، حدیث 4884. و مشکوٰة المصابیح، حدیث 4983.

13۔ رواہ ابوداؤد. و مشکوٰة المصابیح، الفصل الثّانی، باب الشّفقة علیٰ الخلق و الرّحمة، حدیث نمبر 4985.

14۔ یہاں پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کے مرتب کردہ ''خطبات شیخ الہند (حضرت شیخ الہند: ایک سیاسی مطالعہ)'' میں خطبے کے اس مقام پر ایک ڈیڑھ صفحے کی عبارت شامل ہونے سے رہ گئی ہے۔ غالبًا ڈاکٹر صاحب کے پاس اس خطبے کا کوئی ناقص ایڈیشن تھا، یا شاید کاتب نے کتابت کے دوران دو صفحے کی عبارت چھوڑ دی ہے۔ ہم نے ''جمعیت علمائے ہند؛ دستاویز مرکزی اجلاس ہائے عام'' مرتبہ پروین روزینہ سے اصل متن کی تصحیح کردی ہے۔ (مرتب)

15۔ رواہ البخاری، کتاب الإیمان، باب خوف المؤمن، حدیث نمبر 48.

16۔ أخرجۂ ابو داؤد، کتاب الآداب، باب فی الغیبة، حدیث نمبر 4882.

17۔ رواہ البخاری فی کتاب الحجّ، باب الخطبة أیّام منیٰ، حدیث نمبر 1739. و أخرجۂ التّرمذی فی کتاب الفتن، حدیث نمبر 2193.

18۔ القرآن 93:4۔

19۔ القرآن 28:3۔

20۔ تفسیر ابن جریر طبری، سورت آلِ عمران، آیت نمبر 28، ج:3، ص:1738، طبع: دارالسلام، بیروت۔

21۔ رواہ ابوداؤد، کتاب الدّیات، باب إیقاد المسلم بالکافر، حدیث نمبر 4530. و رواہٗ أحمد فی مسندہٖ؛ مسندِ علی،

www.rahimia.org

حدیث نمبر 993، ج:2، ص:86-285.

22۔ حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ ''نقشِ حیات'' میں برطانوی اور یورپین قوموں کی لوٹ کھسوٹ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''انگریزوں نے قوت پاتے ہی تمام ایشیائی اور افریقی ممالک کو غلام بنانے اور اپنی جبروت و اقتدار کے ماتحت کچلنے اور اُن کو لوٹ کر اپنے ملک اور قوم کو تنومند اور موٹا بنانے اور تمام باشندگانِ ایشیا اور افریقا کا خون ہمیشہ چوستے رہنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ بالخصوص جب کہ 1857ء میں اپنے جبر و اِستبداد کا وحشیانہ مظاہرہ کرنے کے بعد انھوں نے تمام ہندوستان کو اپنے گمان میں فنا کر دیا تھا، تو دوسرے ممالک پر انتہائی چالاکی اور عیاری کے ساتھ پل پڑے۔ سب سے زیادہ انھوں نے حکومتِ عثمانیہ (تُرک) کو اپنے تیر و نشتر کا نشانہ بنایا۔ اور اسی طرح ایران، چین، ہندچینی، جاوا، برہمہ (برما)، ساٹرا وغیرہ اور افریقا کے سواحل اور ممالک پر چیرہ دستی شروع کی۔...''

حضرت مدنیؒ مزید تحریر فرماتے ہیں: ''ہم مختصر نوٹ درباره سلطنتِ عثمانیہ وغیرہ پیش کرتے ہیں، تاکہ ناظرین اس سے برطانیہ کی نیت اور طرزِ عمل سے اُن امور کا اندازہ کرلیں، جن کو حضرت شیخ الہند (محمود حسن) رحمۃ اللہ علیہ نے اندازہ کیا تھا۔

اس مقام پر ہم اقوامِ یورپ اور تُرکی کی پُرانی تاریخ کو پیش کرنے سے اعراض کرتے ہوئے صرف 1856ء سے واقعات کو اجمالاً شروع کرتے ہیں، جب کہ برطانیہ کو کافی اقتدار اور قوت حاصل ہوگئی تھی۔ 25/فروری 1856ء کو پیرس میں ایک معاہدے کی مجلس منعقد ہوئی، جس میں دولتِ عثمانیہ، فرانس، انگلستان، روس، آسٹریا، ساڈینیا کے نمائندے شریک ہوئے۔ آخر میں پرشیا (ایران) کو بھی شریک کرلیا گیا۔ ایک ماہ کے بحث و مباحثے کے بعد 30/ مارچ 1856ء کو ''صلح نامہ پیرس'' مرتب ہوا اور مذکورہ بالا سات حکومتوں کے نمائندوں نے اس پر دستخط کیے۔...

عہد نامہ پیرس کی خلاف ورزیاں:

(۱) 1870ء میں روس نے ''صلح نامہ پیرس'' کی خلاف ورزی کی۔ اور اعلان کرتے ہوئے بحرِ اسود میں جنگی جہازوں کے ذریعے اپنا تسلط پھر قائم کرلیا۔

(۲) 1878ء میں بسراویا کا علاقہ سلطنتِ عثمانیہ سے چھین لیا گیا۔

(۳) 1858ء میں مولدیویا اور وِلاچیا کی ریاستوں میں بغاوت پیدا کی گئی۔

(۴) اس کے بعد کریٹ، سربیا، مونٹی نگرو، بوسینیا، ہرزیگوینیا اور بلغاریہ میں بغاوت کی شورشیں برپا کروائی گئیں۔ معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عثمانی فوجوں کو اس علاقے میں داخل ہونے سے روکا۔

(۵) 1866ء میں کریٹ کے یونانیوں سے بغاوت کرائی گئی اور اُس پر قبضہ کیا گیا۔

(۶) جولائی 1858ء میں جدہ کے عیسائیوں اور مسلمانوں میں جھگڑا پیدا کرایا گیا۔ اس پر انگریزی بیڑے نے جدہ پر گولہ باری شروع کر دی۔

(۷) 1860ء میں شام میں دروزیوں اور مارونیوں میں جھگڑا کرایا گیا۔ دروزی مسلمان تھے اور مارونی کیتھولک عیسائی تھے۔ کشت وخون کی نوبت آئی۔ کسان مارونیوں نے ابتدا کی۔ چوں کہ یہ ہنگامہ جاگیرداری نظام کی بِنا پر ہوا تھا، اس لیے انھوں نے اپنے ہم مذہب جاگیرداروں پر پہلے حملہ کیا۔ دروزی شیوخ نے بھی مارونی جاگیرداروں کا ساتھ دیا، مگر چند دنوں کے بعد پادریوں کے بھڑکانے سے اس شورش نے مذہبی رنگ اختیار کرلیا اور نہایت تیزی سے شام کے حصوں میں پھیل گئی۔...

(۸) 1868ء میں وِلاچیا اور مولڈیویا کی ولایتوں نے باضابطہ متحد ہوکر رومانیہ کے نام سے ریاست قائم کرلی۔ یہ کارروائی ''صلح نامہ پیرس'' کے خلاف تھی۔

(۹) مارچ 1867ء میں سربیا سے ترکی فوجوں کو نکال دیا گیا اور مستقل ملک کی حیثیت بنا دی گئی۔

(۱۰) 1869ء میں ''صلح نامہ پیرس'' کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کریٹ کو خودمختار ملک بنا دیا گیا۔

(۱۱) 1870ء میں روس نے ''صلح نامہ پیرس'' کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بحرِ اسود پر اپنا قبضہ کرلیا۔

(تفصیلات کے لیے دیکھئے! نقش حیات، از مولانا سیّد حسین احمد مدنی، ج:1، ص:88 تا 112 طبع: عزیز پبلی کیشنز، 56- میکلوڈ روڈ لاہور)

23۔ قاضی محمد عدیل عباسی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''4/ اگست 1914ء کو جنگِ عظیم اوّل کا آغاز ہوا تھا۔ اس کا شرارہ وسطِ یورپ میں چمکا اور دیکھتے ہی دیکھتے مغربی یورپ کا تمام آتش گیر مادۂ جنگ بھڑک اُٹھا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد جنگ نے مسلمانانِ ہند کے لیے ایک ایسی نازک صورتِ حال اختیار کرلی، جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کی پوری تاریخ میں کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ یعنی خلیفۃ المسلمین بھی میدانِ جنگ میں مشغولِ پیکار نظر آئے۔ اس موقع پر ترکی کے خلاف برطانیہ نے بھی اعلانِ جنگ کردیا۔ چناں چہ 2/ نومبر 1914ء کو اعلانِ جنگ کی اطلاع جب سرکاری طور پر ہندوستان میں مشتہر کی گئی تو ساتھ ہی حسبِ ذیل اُمور کا بھی اعلان کیا گیا:

(۱) ترکی حکومت کے ساتھ ہماری جنگ دفاعی ہے، نہ کہ حملہ آورانہ ...اب مجبوراً ہم کو بھی اعلانِ جنگ کرنا پڑا۔

(۲) ہندوستان کے مسلمانوں کو پوری طرح بھروسہ رکھنا چاہیے کہ اس جنگ میں ہمارے یا ہمارے ساتھیوں کی جانب سے کوئی ایسی بات نہیں ہوگی، جو ان کے مذہبی محسوسات کو صدمہ پہنچائے۔ اسلام کے تمام مقدس مقامات محفوظ رہیں گے، جن میں عراق بھی داخل ہے۔ ان کے احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ اسلام کے مقدس مقامِ خلافت کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہ آئے گی۔ گورنمنٹ برطانیہ نہ صرف اپنی جانب سے، بلکہ اپنے تمام حلیفوں کی جانب سے ان باتوں کی ذمہ داری لیتی ہے۔

(تحریکِ خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، ص:68، بحوالہ حضرت مدنی کی سیاسی ڈائری، ج:1، ص:27-526، طبع: کراچی)

24۔ جنگِ عظیم اول کے بعد اتحادی قوتوں نے خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے اور اُس کے علاقوں کو ہڑپ کرنے کے لیے 10/ اگست 1920ء کو معاہدۂ سیورے (Treaty of Sevres) کیا، جو بہ ظاہر اتحادی قوتوں اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان طے پانے والا امن معاہدہ تھا۔ اس معاہدے پر عثمانی سلطنت نے دستخط کر دیے تھے۔ اس معاہدے کو سلطنت عثمانیہ کی ایک عظیم شکست سمجھا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ اپریل 1920ء میں اتحادیوں کے درمیان ''سان ریمو کانفرنس'' (San Remo conference) کے بعد طے پانے والے معاہدوں کی ایک کڑی تھا۔ اس معاہدے کے تحت حجاز (موجودہ سعودی عرب کا صوبہ) اور آرمینیا آزاد ممالک قرار دیے گئے۔ معاہدے کے سیکشن III کے آرٹیکل 62 تا 64 کے مطابق کردستان کو بھی آزادی ملنی تھی اور کرد ولایت موصل بھی آزاد کردستان میں شمولیت اختیار کرسکتی تھی۔ دوران جنگ سائیکس پیکوٹ معاہدے کے تحت بین النہرین یعنی (دجلہ اور فرات کے درمیان علاقہ) میسوپوٹیمیا (موجودہ عراق) اور فلسطین برطانیہ اور لبنان اور شام کا علاقہ فرانس کے انتظام میں دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ بحیرہ روم میں جزائر ڈوڈ کینیز اور رہوڈز (جو 1911ء سے ہی اٹلی کے قبضے میں تھے) کے علاوہ شمالی اناطولیہ اٹلی کو دے دیا گیا، جب کہ تھریس اور مغربی اناطولیہ یونان کا حصہ قرار دیا گیا جس میں سمرنا (موجودہ ازمیر) کی اہم ترین بندرگاہ بھی شامل تھی۔۔ باسفورس، درہ دانیال اور بحیرہ مرمرہ کو غیر فوجی اور بین الاقوامی علاقہ قرار دیا گیا اور عثمانی افواج کی تعداد کو 50 ہزار تک محدود کردیا گیا۔

اس معاہدے کو ترکی کی جمہوری تحریک نے مسترد کر دیا اور اس معاہدے پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک کی زیرِ قیادت اس تحریک نے معاہدۂ سیورے کے بعد ترکی کی جنگِ آزادی کا اعلان کر دیا اور قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) میں بادشاہت کو ختم کر کے ترکی کو جمہوریہ بنادیا۔ انقرہ میں ترکی کی قومی اسمبلی نے معاہدے کو مسترد کرتے ہوئے مغربی اناطولیہ میں یونانی افواج کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی کو روکا۔ مارچ 1921ء میں مصطفیٰ کمال کے حامیوں نے سوویت روس کی بالشویک حکومت سے دوستی کا معاہدہ کرلیا جس کے نتیجے میں

کمالیوں نے ستمبر 1922ء تک یونان کو شکست دے کر اس کی افواج کو اناطولیہ سے نکال باہر کیا۔ اس زبردست فتح کے بعد جنگ عظیم اوّل کے اتحادی مذاکرات کی میز پر آنے پر مجبور ہو گئے اور 1923ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر لوزان میں معاہدہ سیورے کو ترکی کے حق میں منسوخ کر دیا گیا۔ معاہدہ لوزان ترکی کی عظیم فتح سمجھا جاتا ہے۔ معاہدہ لوزان 24/ جولائی 1923ء کو سوئٹزرلینڈ کے شہر لوزان میں جنگ عظیم اول کے اتحادیوں اور ترکی کے درمیان طے پایا۔ معاہدے کے تحت یونان، بلغاریہ اور ترکی کی سرحدیں متعین کی گئیں اور قبرص، عراق اور شام پر ترکی کا دعویٰ ختم کر کے آخر الذکر دونوں ممالک کی سرحدوں کا تعین کیا گیا۔ اس معاہدے کے تحت جمہوریہ ترکی کو عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا۔ (وکی پیڈیا)

25۔ رواه البخاری، كتاب الجهاد و السّير، باب هل يستشفع إلىٰ أهل الذّمة الخ. حديث نمبر 3053.

26۔ كنز العُمّال، ج:5، ص:110. الدّرّ المنثور، ج:3، صفحه 227.

27۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی ''نقشِ حیات'' میں لکھتے ہیں:

''فتح بیت المقدس پر وزیرِ اعظم انگلستان لائڈ جارج نے اپنے بیان میں اس کو صلیبی جنگ قرار دیا تھا۔'' (ج:2،ص:216)

28۔ القرآن 1:60۔

29۔ ایضاً۔

30۔ تفسير الخازن المسمّىٰ لباب التّأويل فى معانى التّنزيل، تاليف: علاؤالدين على بن محمد بن إبراهيم البغدادى الشّهير بالخازن، تفسير سورت الممتحنه. آيت نمبر1، ج:4، ص:279. طبع: دارالكتب العلميه، بيروت.

31۔ ایضاً۔

32۔ ایضاً،ص:280۔

33۔ تفسير الطّبرى "جامع البيان عن تأويل آى القرآن" لابى جعفر محمّد بن جرير الطّبرى، تفسير سورة الممتحنة، آيت نمبر1، ج:10،ص:7986،طبع: دارالسلام، قاہرہ اسکندریہ۔

34۔ القرآن 9:60۔

35۔ یہاں پر خطبات جمعیت علمائے ہند میں درجِ ذیل حاشیے کا فٹ نوٹ ہے:

''مگر یہ مطلب نہیں ہے کہ جن کافروں نے یہ کام کیے ہوں، ان کے ساتھ مدت العمر (تمام عمر) موالات حرام ہیں۔ اس لیے کہ ان کاموں کے کرنے والے جب مسلمان ہوجائیں تو ان کی گزشتہ کارروائیاں اسلام لاتے ہی کالعدم ہوجاتی ہیں۔ یا ان سے مسلمان صلح کرلیں تو صلح کی شرائط کی تعمیل ضروری ہوجاتی ہے۔ جیسے کفارِ مکہ سے صلح حدیبیہ کی شرائط کے ماتحت حضورؐ نے ان مسلمانوں کو واپس کر دیا، جو کفار کی قید سے کسی طرح نکل کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔''

36۔ تفسير الخازن المسمّىٰ لباب التّأويل فى معانى التّنزيل، تاليف: علاؤالدين على بن محمد بن إبراهيم البغدادى الشّهير بالخازن، تفسير سورت المائدة، آيت نمبر51، ج:1، ص:52. طبع: دارالكتب العلميه، بيروت.

37۔ القرآن 51:5۔

38۔ القرآن 52:5۔

39۔ القرآن 47:30۔

40۔ مولوی ظفر علی خاں (ایڈیٹر اخبار 'زمیندار'): مولانا ظفر علی خان 19/جنوری 1873ء میں وزیرآباد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم مشن ہائی اسکول وزیرآباد سے مکمل کی اور گریجویشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کی۔ کچھ عرصہ وہ نواب محسن الملک کے معتمد

www.rahimia.org

(Secretary) کے طور پر بمبئی میں کام کرتے رہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ مترجم کی حیثیت سے حیدرآباد دکن میں کام کیا اور محکمہ داخلہ (Home Department) کے معتمد کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ 1908ء میں لاہور آئے، روزنامہ زمیندار کی ادارت سنبھالی جسے ان کے والد مولوی سراج الدین احمد نے 1903ء میں شروع کیا تھا۔ مولانا کو''اردوصحافت کا امام'' کہا جاتا ہے۔ اور زمیندار ایک موقع پر پنجاب کا سب سے اہم اخبار بن گیا تھا۔ زمیندار ایک اردو اخبار تھا جو بطور خاص مسلمانوں کے لیے نکالا گیا تھا۔ اس اخبار نے مسلمانوں کی بیداری اور ان کے سیاسی شعور کی تربیت کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ انھوں نے تحریکِ خلافت میں بڑا بھرپور حصہ لیا۔ اسی بنا پر انھیں حکومتِ برطانیہ نے گرفتار کیا تھا۔ مولانا نے صحافیانہ زندگی کی شروعات انتہائی دشوار گزار اور ناموافق حالات میں کی۔ اس زمانے میں لاہور اشاعت کا مرکز تھا۔ 1934ء میں جب پنجاب حکومت نے اخبار پر پابندی عائد کی تو مولانا ظفرعلی خان جو اپنی جرأت اور شان دارعزم کے مالک تھے، انھوں نے حکومت پر مقدمہ کر دیا اور عدلیہ کے ذریعے حکومت کو اپنے احکامات واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے 27/نومبر 1956ء کو وزیرآباد کے قریب اپنے آبائی شہر کرم آباد میں وفات پائی۔ ان کی نمازِ جنازہ ان کے ساتھی محمد عبدالغفور ہزاروی نے پڑھائی۔ ان کا مزار کرم آباد میں ہے۔

41۔ مولوی لقاء اللہ پانی پتیؒ: حضرت مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتیؒ (1890-1969ء) مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ پانی پت میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ جمعیت علمائے ہند کے بانی اراکین میں سے تھے۔ تحریکِ خلافت میں نمایاں حصہ لیا۔ بڑے جری اور بہادر تھے۔ اسی حوالے سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ 1947ء میں جب مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی اور انھیں وہاں سے نکلنا پڑا تو پانی پت بھی عملاً مسلمانوں سے خالی ہوگیا، لیکن آپ نے جدِامجد کے آستانے سے الگ ہونا کسی صورت گوارا نہ کیا۔ آپ کے استقلال سے مسلمانوں کے اُکھڑے ہوئے قدم جم گئے۔ آپؒ جمعیت علمائے ہند کے اہم ارکان میں سے تھے۔ اس لیے پانی پت کے مسلمانوں کی حفاظت اور دینی مدارس کے نظام کو محفوظ کرنے کے لیے بہت کردار ادا کیا۔ اُن کی ایک تحریر مولانا سیّد محمد میاںؒ نے نقل کی ہے، جس میں مولانا لقاء اللہ عثمانی تحریر فرماتے ہیں: ''(1947ء میں) ہنگاموں کے ختم ہونے اور فضا کے ساکن ہونے کے بعد جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ مکمل تخلیہ اور انخلا کے باوجود مسلمان دیہاتوں میں موجود ہیں تو جمعیت علمائے ہند کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے اصرار شروع ہوا کہ پانی پت میں دینی تعلیم کا سلسلہ ازسرِ نو شروع کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ دیہات کے مسلمان بچوں کو یہاں لا کر رکھا جائے اور اُن کو دینی تعلیم سے آشنا کیا جائے۔ اس تحریک کو حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تائید سے تقویت حاصل ہوئی۔ چناں چہ ستمبر 1952ء سے دینی تعلیم کا مکتب قائم کیا گیا۔'' (پانی پت اور بزرگانِ پانی پت، از مولانا سیّد محمد میاں، ص: 343، طبع: جمعیت پبلی کیشنز، لاہور: اگست 2004ء) مولانا عبدالماجد دریاآبادی لکھتے ہیں: ''ہند و پاکستان کے مسلمانوں میں کوئی مجھ سے اگر فرمائش کرتا ہے کہ دس مخلص ترین انسانوں کے نام بتاؤ تو اس ننھی منھی سی فہرست میں میرے علم و یقین کے مطابق ایک نام مولانا حافظ لقاء اللہ عثمانی پانی پتی کا ضرور ہوتا ہے۔ مخلص مسلمان نایاب نہیں، ماشاء اللہ! ابھی بڑی تعداد میں ہیں، لیکن لقاء اللہ عثمانی ان میں گلِ سرسبد تھے۔ قومی وملّی کاموں میں پیش پیش رہے۔ کامل تدین واخلاص کے ساتھ ادنیٰ خدمت گاہ کے ساتھ گھل مل کر کام کرتے اور دوسروں کی خدمت کر کے خوش ہوتے تھے۔'' اسّی برس کی عمر میں جنوری 1969ء میں پانی پت میں وصال ہوا۔ (مشاہیر علما، از ڈاکٹر قاری فیوض الرحمٰن، ص: 171، جامعہ عثمانیہ، لانڈھی ٹاؤن کراچی)

42۔ صوفی اقبال احمد انصاری پانی پتیؒ: ان کا تعلق ہندوستان کے مشہور شہر پانی پت سے تھا۔ آپؒ پانی پت شہر میں ہی پیدا ہوئے۔ والدِگرامی کا نام حافظ علی محمد تھا۔ گھر کا ماحول مذہبی ہونے کی وجہ سے دینِ اسلام اور خلافتِ اسلامیہ کے ساتھ عقیدت کا تعلق تھا۔ خاندانی پیشہ زمین داری تھا۔ برِعظیم کی تحریکِ آزادی میں آپؒ انتہائی سرگرم تھے۔ ان کا شمار ہریانہ کے علاقے میں تحریکِ خلافت کی بنیاد رکھنے والوں میں کیا جاتا ہے۔ اس تحریک میں آپؒ نے مولانا لقاء اللہ عثمانیؒ کے ساتھ مل کر کام کیا۔ انھوں نے ستمبر 1920ء میں جب تحریکِ عدم تعاون اپنے

زوروں پر تھی تو اس وقت پانی پت اور اس کے مضافات میں اس تحریک کو منظم کیا۔ اوائل اکتوبر 1920ء میں تحریکِ خلافت کے تحت سونی پت کی جامع مسجد میں انگریز سامراج کے خلاف تقریر کرنے کی پاداش میں صوفی اقبال احمد پانی پتیؒ اور مولانا لقاء اللہ پانی پتیؒ کو گرفتار کرلیا گیا۔ گرفتاری کے بعد دیگر افراد کے ساتھ ساتھ ان دونوں حضرات کو روہتک جیل منتقل کردیا گیا۔ 8/ اکتوبر 1920ء سے تحریکِ خلافت کے مرکزی رہنماؤں مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا شوکت علیؒ نے گاندھی جی کے ساتھ مل کر ان حضرات کی رہائی کے لیے جدوجہد شروع کی۔ جلسے جلوس اور کانفرنسز کے ذریعے رہنماؤں کی رہائی کا مطالبہ زور وشور سے کیا گیا۔ اس دوران یہ تمام رہنما ملاقات کے لیے جیل بھی گئے، لیکن انگریز افسران نے ملنے نہیں دیا۔ جمعیت علمائے ہند کے اس اجلاسِ دوم کے موقع پر حضرت شیخ الہندؒ نے بھی ان کی رہائی کے لیے آواز بلند کی۔ انھیں 5 سال کی قید گزارنے کے بعد رہائی ملی تو وہ دوبارہ اجتماعی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے۔ 1926ء میں انجمن اسلامیہ پانی پت کے سیکرٹری منتخب ہوئے اور تادمِ مرگ مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کرتے رہے۔ 10/ مارچ 1932ء کو پانی پت میں وفات پائی۔ خواجہ سہیل احمد انصاری پانی پتی نے اپنی ایک طویل نظم ''پانی پت کے نام'' میں ان الفاظ میں موصوف کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے ؎

ابتدائے جنگِ آزادی ہوئی اقبال سے　　غلغلہ اٹھا وطن میں تیرے ہی اس لال سے

(یہ حاشیہ محترم جناب وسیم اعجاز صاحب کے شکریے کے ساتھ یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے درج ذیل کتابوں سے مدد لی ہے:
1- Haryana: A Historical Perspective,　　2- Rebels against the raj
(3- The Punjab in 1920,　　4- Muslim India (1857-1947)

43۔ مولانا سیّد محمد محمد فاخر الٰہ آبادیؒ: آپؒ کا تعلق ''دائرۂ شاہ اجمل'' الٰہ آباد سے ہے۔ ان کے والد ماجد حضرت سیّد محمد زاہد الٰہ آبادیؒ ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۲۹۲ھ/ 1875ء میں ہوئی۔ انھوں نے علم و معرفت کے ماحول میں نشوونما پائی۔ ابتدائی تعلیم الٰہ آباد ہی میں حاصل کی۔ آپؒ کے اساتذہ میں مولانا حضرت مولانا شاہ احمد حسن کان پوریؒ بھی تھے۔ ۱۳۰۹ھ/ 1892ء میں مدرسہ فیضِ عام کان پور سے فراغت کی سند حاصل کی۔ 1912ء میں اپنے والدِ گرامی سے سلسلۂ چشتیہ میں مرید ہوئے۔ مولانا شاہ محمد بشیر اجملیؒ اور مولانا شاہ محمد عبدالعلیم قادری رشیدیؒ نے بھی آپؒ کو شرفِ خلافت سے نوازا۔ شاہ محمد فاخر الٰہ آبادیؒ اسلامی ہند کے ممتاز علما و مشائخ کی صفِ اوّل میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی تقاریر میں ایک خاص شان ہوا کرتی تھی۔ پورا ملک ان کے مواعظِ حسنہ سے فیض یاب تھا۔ قومی و ملّی خدمات ان کے عظیم ترین کارنامے ہیں۔ (حیات مخدوم الاولیا، از شاہ محمود احمد قادری) جب انگریزی جارحیت کے خلاف تحریک خلافت کی بنیاد پڑی تو آپؒ اس وقت بننے والی خلافت کمیٹی کے اراکین میں سے تھے۔ نومبر 1919ء میں خلافت کانفرنس کے بعد مولانا عبدالباریؒ کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں جو علما شریک تھے، ان میں آپؒ کا نام بھی نمایاں ہے۔ جمعیت علمائے ہند کے بانی اراکین میں آپؒ کا شمار ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر جمعیت علمائے ہند کی سب سے پہلی مجلسِ منتظمہ میں شامل تھے۔ تحریکِ خلافت کے مقاصد کی ترویج کے لیے پورے ملک میں طوفانی دورے کیے اور تحریکِ خلافت کی جڑوں کو مضبوط کیا۔ (تحریکِ خلافت از محمد عدیل عباسی) ان کی دینی وملّی خدمات کا اعتراف نواب محمد اسماعیل خاں وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے 19 مارچ 1920ء کو ہونے والے یومِ خلافت کی تقریب میں اپنے خطبۂ استقبالیہ میں بھی کیا۔ آپؒ کا شمار ان 500 علمائے کرام میں بھی ہوتا ہے، جنھوں نے ترکِ موالات کے حق میں متفقہ فتویٰ دیا تھا۔ تحریکِ خلافت کے سلسلے میں جب گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو 21/ جولائی 1920ء کو مقدمے کا فیصلہ ہوا اور ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے ساتھ 5 سیر ''مونجھ بانٹنے'' کی سزا ہوئی۔ اس وقت آپؒ نے برجستہ یہ شعر کہے:

آنکھ ہے محوِ تجلی ، وصل سے دل شاد ہے　　قید میں بھی طبع بے خود ہر طرح آزاد ہے
بیڑیاں مجھ کو پہننے میں ذرا ذلت نہیں　　باپ دادا کا طریقہ سنتِ سجاد ہے

(اردو میں قومی شاعری کے سو سال)

آپؒ کا وصال ۷/صفر المظفر ۱۳۴۹ھ/ 5/جولائی 1930ء کو ہوا۔ شیخ محمد افضل الہ آبادیؒ کے روضۂ منورہ میں تدفین عمل میں لائی گئی۔ آپؒ کے فرزند شاہ محمد شاہد فاخریؒ بھی ملک کی نامور شخصیت تھے۔ تحریکِ آزادی کے سرگرم کارکن تھے۔ تحریکِ خلافت کے سلسلے میں انھوں نے بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ جمعیت علمائے ہند یو۔پی کے صدر تھے اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے یو۔پی اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔ (ماہنامہ ''فروغِ اردو'' لکھنؤ، جنوری فروری 1968ء) (حاشیہ بہ شکریہ محترم وسیم اعجاز کراچی)

44۔ انگریزوں نے اسلامی حقِ شفعہ کو بدل کر 1913ء میں نیا قانونِ شفعہ بنایا تھا۔ اس کی مندرجہ ذیل شقیں اسلامی قانونِ شفعہ سے متصادم ہیں:

i۔ مزارع کو اپنی زیرِ مزارعت زمین پر سب سے پہلا حقِ شفع دینے کی تصریح کی گئی ہے۔ قرآن وسنت کے احکام کے خلاف ہے۔

ii۔ بائع کے متوقع وارثوں کو شفعہ کا حق دینا۔

iii۔ شریکِ ملکیت کے حقِ شفعہ کو دوسروں سے مؤخر کرنا، جب کہ سنت کی رُو سے اُس کا حق سب سے مقدم ہے۔

iv۔ کسی محال (estate) کی پٹی یا کسی دوسری ذیلی تقسیم (sub-division) کے مالکان کو اس علاقے میں واقع ہر جائیداد کی فروخت میں حقِ شفعہ دینا، نیز مزارعین کو یا شریکِ حقوق اور شرعی پڑوسی کے سوا کسی اَور شخص کو شفعہ کا حق دار قرار دینا۔

v۔ مختلف قسم کی غیرمنقولہ جائیدادوں کو شفعہ سے مستثنٰی کیا گیا ہے۔ شفعہ سے استثنٰی صرف اُن جائیدادوں کو ہے، جو کہ وقف ہوں، لیکن جو عمارتیں شخصی ملکیت میں ہوں، اُن کو شفعہ سے مستثنٰی کرنا درست نہیں ہے۔ نجی ملکیت کی اراضی کا استثنٰی درست نہیں۔ یہ اسلامی احکام کے منافی ہے۔ صوبائی حکومت کو یہ اختیار دینا کہ وہ جس اراضی کو چاہے استثنٰی دے سکتی ہے، درست نہیں۔

vi۔ حقِ شفعہ کے مطالبہ کرنے کی معقول مدت کا ذکر نہیں، جو کہ حقِ شفعہ کی لازمی شرط ہے۔ اس کے برعکس شفعہ کے مقدمے کو عام قانونِ میعادِ سماعت کے تابع کر کے ایک سال کی مدت مقرر کی گئی ہے، جو کہ درست نہیں ہے۔

قبضہ مخالفانہ کا قانون سراسر اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ انگریزوں نے قبضہ مخالفانہ کا قانون بنایا کہ اگر ناجائز قابض 12 سال سے مسلسل کسی جائیداد یا اراضی پر قابض ہے تو وہ بذریعہ عدالت دعویٰ استقرارِ حق کر کے متعلقہ جائیداد یا اراضی کو اپنے نام کروا سکتا ہے۔ اس قانون کی بنیاد ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' (Might is Right) پر رکھی گئی ہے، جو کہ مکمل طور پر غلط ہے۔ مالک ہر صورت میں مالک ہے۔ کوئی بھی ناجائز قابض جب تک قانونِ بیع وشرا کے تحت جائیداد کی قیمت ادا نہیں کرتا، وہ کسی صورت میں مالک نہیں بن سکتا۔ قبضہ مخالفانہ خواہ کتنی ہی طویل مدت تک برقرار رہے، وہ حقیقی مالک کے حق کو ختم نہیں کر سکتا اور نہ ہی غاصب کو مالک بنا سکتا ہے۔ دراصل یہ قانون جنگِ آزادی میں حریت پسندوں کی جائیداد کا قبضہ انگریزوں کے آلہ کاروں کو دینے کے لیے بنایا گیا تھا۔

(حاشیہ کے لیے معلومات بہ شکریہ انیس احمد سجاد ایڈووکیٹ لاہور)

45۔ ہفت روزہ اخبار ''مدینہ'' بجنور۔ 5 تا 9/دسمبر 1920ء۔ بہ حوالہ تذکرۂ شیخ الہندؒ۔ اگرچہ ''تذکرۂ شیخ الہندؒ'' میں شروع کا خطبہ مسنونہ اور خاتمے کا سلام محفوظ نہ تھا۔ اس کی تکمیل میں ''خطباتِ شیخ الہند'' سے مدد لی گئی ہے۔

46۔ القرآن 153:6۔

47۔ القرآن 125:16۔

48۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ان جملوں میں ملفوف اشارات کی تشریح کرتے ہوئے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ اس مسئلے کی حقیقی نوعیت کا گہرائی میں جا کر تجزیہ کرتے ہیں اور اس کا ایک جامع حل پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہندو مسلم اختلاف کو رفع کرنے کی بارہا کوششیں کی گئیں، مگر ان میں سے کوئی بھی بارآور نہ ہوسکی۔ کیوں کہ مسئلے کی اصلیت و ماہیت پر غور نہیں کیا جاتا۔ اگر تعمق (گہرائی) سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف ان دو فرقوں میں باہمی اختلاف ہے، بلکہ ہر ایک فرقے

کے اندر قومی اور معاشرتی تقسیمات موجود ہیں۔ مسلمانوں میں اگر پنجابی و سندھی، ہندوستانی اور پٹھان، کشمیری اور بلوچی کا قومی سوال موجود ہے تو ہندوؤں میں بنگالی و بہاری، مدراسی و مرہٹی، گجراتی و مارواڑی کا ملّی مسئلہ پایا جاتا ہے۔ ان قومی اختلافات کو مذہبی یگانگت بھی نہیں مٹا سکتی۔ اس کے بعد ہر ایک قوم میں صنفی (طبقاتی) پیچیدگی موجود ہے۔ مال دار و محنت کش، زمین دار و کسان، سرمایہ دار و مزدور کی باہمی کشاکش ہر ایک ہندوستانی قوم کو دو متقابل اور متعارض صنفوں میں بہ آسانی تقسیم کرسکتی ہے۔ اس لیے صرف مذہبی بنا پر تمام ہندوستانی مسائل اور خصوصاً ہندو مسلم اختلافات کو حل کرنا کوئی راہِ نجات پیدا نہیں کرسکتا۔

لہٰذا ہم اپنے پروگرام میں مذہب کو ان مسائل کے حل کرنے کی اَساس نہیں قرار دیتے، بلکہ قومی اور صنفی تفریق اور اقتصادی و سیاسی اصول پر ان مشکلات کا حل پیش کرتے ہیں، جس کے ذیل میں مذہبی اختلافات بھی معقولیت سے رفع ہو سکتے ہیں۔

ہم ہندوستان کو ایسے ممالک میں تقسیم کرتے ہیں، جہاں:

(الف) ایک قوم آباد ہو۔ (ب) جس کی زبان اور معاشرت میں یکسانی پائی جاتی ہو۔

اس تقسیم کے بعد ہر ایک مذہب کے لیے کسی نہ کسی ملک میں اکثریت حاصل ہونے کی گنجائش ہے۔ اس لیے (اس طرح) مذہبی تنازعات کا قطعی طور پر سدِّ باب ہوسکتا ہے۔ ان ممالک کی جمہوریتوں میں انتخاب کے لیے حقِ نمائندگی مذہبی تفریق کے بجائے صنفی اختلافات کی بنا پر دیا جائے گا۔ اس لیے (اس طرح) چھوٹے مذہبی فرقوں کی بھی حق تلفی نہیں ہوگی۔''

(خطبات و مقالات، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، ص: 40-139، طبع: دارالتحقیق، لاہور: ستمبر 2002ء)

49۔ ماخذ: شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، خطبہ صدارت جمعیت علمائے ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس بہ مقام دہلی، از مہتمم مطبع غنی المطابع، دہلی، بہ حوالہ جمعیت علمائے ہند؛ دستاویزات، مرکزی اجلاس ہائے عام 1919ء تا 1945ء، مرتبہ: پروین روزینہ، ج:1، ص: 54 تا 75، طبع: قومی ادارہ برائے تاریخ تحقیق و ثقافت، اسلام آباد، طبع اوّل: 1980ء۔

☆

www.rahimia.org

مطالعۂ ردِ نو آبادیات

نو آبادیاتی دور کے ہندوستان میں انگریزی ادب کی تعلیم
ایک ردِنو آبادیاتی تجزیہ

تحریر: شاہ زیب خان

ادب، سماج اور سیاست

ادب (یا لٹریچر) کو اکثر سیاست سے بالا تر سمجھا جاتا ہے۔ ایک عرصے تک مغربی اداروں، خاص طور پر یونیورسٹیوں میں چوں کہ ادب کو کلچر کے تابع سمجھا جاتا تھا، اس لیے ادب پر جو بھی تنقید لکھی جاتی تھی، اسے معاشرے کی سیاست اور کشاکشی سے علاحدہ رکھا جاتا تھا۔ اس کا زیادہ تر تعلق ادب کے جمالیاتی، تاریخی یا معاشرے کی عکاسی کے پہلوؤں سے ہوتا تھا۔ ادب اور سیاست یا سامراجیت کے باہمی اشتراک پر مغربی یونیورسٹیوں کے مطالعات کا آغاز تو تقریباً پانچ دہائیاں پہلے ہوا، مگر ہندوستان میں سیاسی شعور رکھنے والے علما و دانش ور انگریزی ادب و سامراجیت کے اس الحاق کو مغربی مفکرین سے ایک صدی پہلے سمجھ چکے تھے اور اپنے شعر وسخن میں اس سامراجی کھیل کی حقیقت کو آشکار کرتے رہے تھے۔ ایسے ہی مفکرین میں ایک اہم نام اکبرالہ آبادی کا ہے۔ جس دور میں اکبرالہ آبادی یہ شعر کہہ رہے تھے، اسی دور میں انگریزی ادب کو انگریزی نظامِ تعلیم میں ایک بنیادی حیثیت دی جارہی تھی۔ لہٰذا وہ ایسی ہی تعلیم کے حوالے سے فرماتے ہیں:

شیخِ مرحوم کا قول مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

اسی طرح ملاحظہ فرمائیں:

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں ، وہ کیا ہے ، فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے ، وہ کیا ہے ، فقط سرکاری ہے

اور

ہوشیار رہ کے پڑھنا ، اس جال میں نہ پڑنا
یورپ نے یہ کہا ہے ، یورپ نے وہ کہا ہے

اسی طرح دیگر اشعار میں اکبرالہ آبادی نے تعلیم اور سیاست یا سامراجیت کے گٹھ جوڑ کو جس طرح بے نقاب کیا، وہ اس خطے کے حکما کی عقل و دانش کی اعلیٰ مثال ہے۔

www.rahimia.org

مغرب کے مرشدوں سے تو پڑھ چکا بہت کچھ
پیرانِ مشرقی سے اب فیض کی نظر لے

وہ مفکرین جنھوں نے مغرب میں بیٹھ کر ادب و سیاست کے اشتراک کا پردہ چاک کیا، ان نقادوں میں ایک نمایاں نام فلسطین میں پیدا ہونے والے ایڈورڈ سعید (Edward Said) کا ہے۔ انھیں کے ساتھ ساتھ اس حوالے سے ہندوستانی گائیتری چکرورتی سپیواک (Gayatri Chakraborty Spivak) اور ہومی کے بھابھا (Homi K. Bhabha) کے نام بھی نمایاں ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی تنقید کے ذریعے یہ واضح کیا کہ ادب و کلچر سیاست سے علاحدہ وجود نہیں رکھتے، بلکہ اپنے دور کی سیاسی کش مکش میں ان کا بھی ایک کردار ہوتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ جمالیات، تاریخ اور معاشرے کی عکاسی میں بھی مختلف نظریات چھپے ہوئے ہوتے ہیں، جو پڑھنے والوں، خاص طور پر نوخیز ذہنوں پر دیرپا اثر ڈالتے ہیں۔

ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

''کلچر درحقیقت ایک ناٹک کی مانند ہے، جہاں مختلف سیاسی و نظریاتی مقاصد ایک دوسرے سے نبرد آزما دیکھے جاسکتے ہیں۔'' (1)

اسی تناظر میں سعید نے اپنی 1994ء میں لکھی کتاب ''کلچر اور سامراجیت *(Culture and Imperialism)*'' میں مغربی ادبی فن پاروں، خاص طور پر ناولز میں موجود سامراجیت کی حمایت کے حوالے سے پائے جانے والے تصورات پر نقد کیا ہے۔ ناولز بھی چوں کہ بیانیوں کی ایک شکل ہیں، اسی حوالے سے ان کی بھی اہمیت واضح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''سامراجیت کی اصل جنگ تو یقیناً زمین کے لیے ہوتی ہے، مگر جب بات یہاں تک آتی ہے کہ زمین کس کی ملکیت تھی؟ کس کا حق تھا کہ وہ اس پر سکونت اختیار کرے اور اس کو استعمال میں لے کر آئے؟ ....اور کون اس کے مستقبل کا فیصلہ کرتا ہے؟ ان معاملات پر غور و فکر، اختلاف اور بعض اوقات فیصلے بھی بیانیوں میں ہوتے ہیں۔'' (2)

گو کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ پہلے پہل ادب دنیا کے تمام خطوں میں انسانی اظہار کے لیے کہا گیا۔ شروع میں اس کا اظہار صرف زبان کے ذریعے ہوا۔ پھر جیسے جیسے اور جن جن معاشروں نے لکھنے کے طور طریقے دریافت کر لیے، انھوں نے ادب کو ضبطِ قرطاس بھی کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح ادب لکھی ہوئی حالت میں معاشروں میں پڑھا جانے لگا۔ ادب نے دنیا بھر کے زماں و مکاں میں اَن گِنت انسانی جذبات کی ترجمانی کی۔ روایتی ادبی تنقید میں عموماً اسی حوالے سے (یعنی انسانی جذبات و احساسات، زماں و مکاں کی عکاسی) ادب پر لکھا گیا۔

ادب میں پوسٹ کالونیل (مابعد نو آبادیاتی) مطالعات کے رُجحان نے ادب کے شعبے میں ایک نئی طرح ڈالی، جس میں یورپی ادب، خاص طور پر انگریزی ادب اور سامراج کے تعلق کو اُجاگر کیا۔ یہ عمل ویسے تو مغرب کی ہی یونیورسٹیوں میں وقوع پذیر ہوا، مگر اس تحریک کے اوّل مؤسّسین سعید، سپیواک اور بھابھا ہی مانے جاتے ہیں۔ ان تینوں کا تعلق تیسری دنیا سے تھا۔ انھیں نقادوں نے اپنی تحریروں اور کتابوں کے ذریعے اس بات کو واضح کیا کہ جب بھی ادب کو بہ طورِ نصاب ادارہ جاتی شکل دی گئی تو یہ عمل طاقت ور طبقات، خاص طور پر نظام کے اجارہ دار طبقات کے مفادات کو مدِنظر رکھ کر کیا گیا۔

www.rahimia.org

زیرِنظر مضمون میں اسی حوالے سے انگریزی ادب کے ہندوستان میں آنے کی سیاسی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ مزید براں اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ پاکستان میں آزادی حاصل کرنے کے بعد انگریزی ادب کی تعلیم میں کیا تبدیلیاں آئیں؟ یہ سوال بھی اٹھایا گیا ہے کہ یہاں کے یونیورسٹی نصابات بالعموم اور بالخصوص انگریزی ادب کے نصابات ایک آزاد ریاست و قوم کے تقاضوں کی تکمیل کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے؟

ادب بہ طور ایک ڈسپلن

ادب کی بہ طور ایک مستقل یونیورسٹی ڈسپلن کی تاریخ کوئی زیادہ پرانی نہیں۔ جب برطانیہ میں افادیت پسندی (Utilitarianism) کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس تحریک نے برطانیہ کے روایتی تعلیمی اداروں آکسفرڈ اور کیمبرج پر تنقید کی اور لندن میں قائم مکینکس انسٹیٹیوٹ (Mechanics Institute) کو افادیت پسندی کے فلسفے پر منظّم کرتے ہوئے 1826ء میں ایک یونیورسٹی میں بدلا۔ اس یونیورسٹی کو ''لندن یونیورسٹی'' کا نام دیا گیا۔ انگریزی ادب کی تعلیم کا برطانیہ میں آغاز سب سے پہلے اسی یونیورسٹی میں قومی ترقی و بقا کے اصول پر ہوا۔ لہٰذا 1828ء میں لندن یونیورسٹی میں انگریزی کے پہلے پروفیسر کی تقرری ہوئی۔ ان کا نام پروفیسر ٹامس ڈیل (Thomas Dale) تھا۔ انھوں نے یہ تجویز دی کہ:

> ''ہمیں جیفری چاسر (Geoffrey Chaucer) سے لے کر دورِ حاضر تک کے اپنے تمام عظیم شعرا کو پڑھانے کی ضرورت ہے۔'' (3)

اس تجویز کو اگر ہم سیاسی تناظر میں دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسی دور میں چوں کہ برطانیہ بین الاقوامی سطح پر ایک سامراجی سلطنت کے طور پر مضبوط ہو رہا تھا، لہٰذا ملک کے اندر بھی یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ وہ اپنی تہذیبی شناخت کو ازسرِنو منظّم کرے۔ اس کی تعلیم کو عام کرے، تاکہ انگریز جب دنیا بھر میں قائم اپنی نوآبادیات میں جائیں تو اپنی تہذیبی شناخت کو نہ صرف اُجاگر کریں بلکہ اس کا رعب پیدا کریں۔ اسی افادیت کا تذکرہ ہمیں لندن یونیورسٹی کے ایک اَور پروفیسر اے جے سکاٹ (A.J Scott) کے 1848ء کے ایک لیکچر میں بھی ملتا ہے، جس میں انھوں نے کہا کہ:

> ''عام برطانویوں کے ذہن میں انگریزی ادب کی یہ اہمیت نہیں ہے کہ یہ ہمارا قومی ادب ہے اور اس کے ذریعے ہمیں اپنے ''قومی ذہن'' تک رسائی ملے گی اور اپنے لوگوں کے کردار و حالات کے بارے میں معلومات ملیں گی۔'' (4)

اسی تصور کے تحت نہ صرف ہمیں انگریزی ادب کا شعبہ انیسویں صدی میں ترقی پذیر نظر آتا ہے، بلکہ انگریز قوم کے دیگر ادارے بھی تہذیبی شناخت کے فروغ کے لیے قائم کیے جاتے ہیں۔ 1885ء سے 1900ء کے درمیان قومی سوانح کی لغت "Dictionary of National Biography" تیار کرنے کا آغاز ہوا۔ قومی (شخصی) تصاویر کی گیلری (National Portrait Gallery) 1896ء میں قائم کی گئی۔ اسی طرح انگریزی ادبی شخصیات کی سیریز (Letters Series of English Men) کا اجرا بھی 1880ء کی دہائی میں کیا جاتا ہے۔ (5) اسی انگریزیت (Englishness) کے اقدامی حربے کے تناظر میں ہم انگریزی ادب کے ہندوستان میں آنے کی تاریخ کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

www.rahimia.org

انگریزی ادب کے ہندوستان میں تین ادوار

انگریزی ادب کی بہ طور ایک یونیورسٹی ڈسپلن کے آغاز کے حوالے سے ایک اَور مستند تاریخی پوسٹ کالونیل (مابعد نو آبادیاتی) بیانیہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس نصاب کے بننے میں برطانیہ کی کالونیوں کا بہت اہم کردار ہے۔ دراصل انگریزی ادب کا جنم ہی ہندوستان کی کوکھ سے ہوا ہے۔ اس بارے میں گوری وشواناتھن (Gauri Viswanathan) کہتی ہیں کہ سب سے پہلے انگریزی ادب کی باقاعدہ تعلیم ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے شروع کروائی۔ وہ اپنی 1989ء میں شائع ہونے والی کتاب میں لکھتی ہیں کہ انگریزی ادب کی ہندوستان میں تعلیم رائج کرنے کے حوالے سے تین بنیادی تصورات نظر آتے ہیں:

1۔ سب سے پہلے انگریزی ادب کی آڑ میں مشنری نظریات کو لانے کا تصور

2۔ پھر اس کی تعلیم کے ذریعے ہندوستانیوں کی اَخلاقیات کو نئے سرے سے استوار کرنے کا تصور

3۔ آخرکار 1840ء کے بعد انگریزی ادب کی افادیت کا عملی تصور، یعنی نو آبادیاتی نقطہ نظر سے ایسے افراد کی تیاری جو کہ کالونیل اِزم کے پراجیکٹ کو آگے بڑھا سکیں۔

مؤخر الذکر افراد کو ہی اقدامی انگریزیت (Englishness) کے ذریعے تیار کیا گیا۔ اس کے لیے ہندوستان میں ادب کی آڑ میں انگریز قوم نے اپنے سامراجی تصورات کو انگریزی تعلیم یافتہ طبقوں کے ذہنوں میں راسخ کیا۔ اس دور سے پہلے بھی جو دو ادوار وشواناتھن نے بیان کیے ہیں، ان میں بھی انگریزی ادب کو ایک ڈھال کے طور پر استعمال کیا گیا۔ مصنفہ نے اپنی کتاب میں بہت سے اہم مشنریوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران کی دستاویزات نقل کی ہیں، جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ چوں کہ عیسائیت کی باقاعدہ تعلیم ہندوستان میں نہیں دی جا سکتی تھی، کیوں کہ ایسا کرنے سے ہندوستانیوں کے جذبات مزید برانگیختہ ہو سکتے تھے، اسی لیے انگریزی ادب کے لبادے میں اس کو ہندوستان میں متعارف کروایا گیا۔ اسی حوالے سے ایک مشنری کی رائے کو وشواناتھن نے کچھ اس طرح نقل کیا ہے:

> ''شیکسپیئر... مذہب سے بھرا ہوا ہے ... کامل پروٹیسٹنٹ اصولوں سے، گو کہ یہ (اصول) الفاظ میں بیان نہیں کیے گئے، مگر وہ وہاں موجود ہیں اور ان کے متضاد کا رد بھی ہیں۔ اسی طرح گولڈسمتھ، ایبرکومی میں بھی ذہنی قوت پر بات کرتے ہوئے، اور دوسری بہت سی کتابوں میں جو کہ سکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں، گو کہ یہ کہا جاتا ہے کہ مقامی افراد کا مذہب تبدیل نہیں کیا جائے گا، مگر بلا شبہ ایسی کتابوں کا ان لوگوں کو ہماری (مذہب کی) طرف لانے میں مفید اثر ہوتا ہے۔''(6)

اس کے بعد کے دور میں ہندوستان میں افادیت پسندی کے اصول کے تحت اس بات کا غلبہ نظر آتا ہے کہ انگریزی ادب کو اَخلاقی ترقی کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس تصور کی بنیاد ہی استشراقی تعصب پر تھی۔ چوں کہ انگریز اس خطے کے طور طریقوں سے، یہاں کی تاریخ، زبانوں سے ناواقف تھے اور چوں کہ اُن کی آنکھوں کو ہندوستان کی دولت خیرہ کیے ہوئے تھی، اس لیے وہ اس بات پر مُصِر تھے کہ ہندوستان کو محکوم رکھنے کا کوئی جواز تراشیں۔ وہ جواز یہ گھڑا گیا تھا کہ ان پر تہذیبی و مذہبی ذمہ داری عائد ہوتی

www.rahimia.org

ہے کہ وہ ہندوستان کو 'سچے مذہب'، 'اعلیٰ زبان و تہذیب' سے روشناس کروائیں۔ اسی تصور کے تحت یہ سوچا گیا کہ ہندوستانیوں کے ایک طبقے کو اس اعلیٰ تہذیب کے مطابق تیار کیا جائے۔ خواہ وہ رنگت کے اعتبار سے ہندوستانی رہیں، مگر سوچ، جمالیات، آرا اور اَخلاقیات کے اعتبار سے انگریز بن جائیں۔

مگر اس تصور کا بھی جلد ہی غلط نتیجہ نکلا اور یہ دیکھا گیا کہ اس طبقے کی انگریزی ادب پڑھنے کے نتیجے میں اَخلاقیات قطعاً بہتر نہیں ہوتیں، بلکہ اکثر اوقات مزید بگڑتی ہیں۔ لہٰذا تیسرا تصور سامنے آیا، جس کے تحت اس ڈسپلن کی افادیتِ عملی یعنی ایک ایسے طبقے کی تیاری — جو ذہنی طور پر انگریز ہو — کا اظہار ہوا۔ اسی تیسرے دور میں ہمیں انگریزی ادب ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں داخل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ جب 1857ء میں کمپنی کے متعین کردہ تین پریزیڈینسی ٹاؤنز میں پہلی تین کالونیل یونیورسٹیاں کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں قائم کی گئیں۔

پنجاب یونیورسٹی کا قیام اور انگریزی ذریعۂ تعلیم

پنجاب میں چوتھی کالونیل یونیورسٹی کے قیام کی تحریک کا آغاز 1865ء سے ہی ہو گیا تھا، جب ''انجمنِ پنجاب'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس انجمن کے قیام میں کلیدی کردار گورنمنٹ کالج لاہور (قائم کردہ 1864ء) کے پرنسپل ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر (Dr. G. W. Leitner) کا تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مغربی علوم کی ترویج کے لیے بہترین طریقہ اس کی مقامی زبانوں کے ذریعے ترویج ہے۔ یہ صاحب کلکتہ یونیورسٹی (پنجاب یونیورسٹی کے قیام سے پہلے پنجاب کے کالجوں کے امتحانات وغیرہ کلکتہ یونیورسٹی لیتی تھی) کے طریقۂ امتحان سے شدید نالاں تھے اور اس کے زبردست نقاد تھے۔ دیگر انگریز افسران بھی کلکتہ کے طریقۂ تعلیم کے خلاف تھے۔ مثلاً ای ولماٹ (E. Willmot.) — جو گورنمنٹ کالج دہلی کے پرنسپل تھے — کے بہ قول:

> ''وہ طلبا جو کلکتہ یونیورسٹی سسٹم سے تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ کبھی بھی انگریزی، یا وہ دیگر علوم جو وہ انگریزی میں حاصل کرتے ہیں، ان میں سطحی علم سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ اور یہ کہ ایسی تربیت صرف تقلید کے اصول پر ہے۔ اس بات کا امکان نہیں ہے کہ ایسی تعلیم کے ذریعے ایک ایسی قوم تیار کی جا سکے جو بھرپور اور آزادانہ سوچ کی حامل ہو۔''(7)

پنجاب یونیورسٹی کے قیام کی تحریک کے حوالے سے انجمنِ پنجاب کو پہلی کامیابی 1869ء میں ملی، جب پنجاب یونیورسٹی کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اس کالج کو تجرباتی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ یہ طے کیا گیا کہ اگر یہ سکیم کامیاب رہی تو آگے چل کر اسی اصول، یعنی اعلیٰ تعلیم کی مقامی زبانوں میں ترویج ہونے پر اس کو پنجاب یونیورسٹی میں بدل دیا جائے گا۔

انجمنِ پنجاب کی اس سکیم کو سب سے زیادہ مزاحمت کا سامنا سردار دیال سنگھ مجیٹھیا کی طرف سے ہوا۔ سردار دیال سنگھ مجیٹھیا امرتسر سے تعلق رکھتے تھے اور انگریزی تعلیم کے حمایتی تھے۔ ان کا نقطۂ نظر بھی وہی تھا جو کہ سرسیّد کا تھا۔ انھوں نے انجمنِ پنجاب کی سکیم کو ناکام بنانے کے لیے ہی 1881ء میں دی ٹریبیون (The Tribune) نامی ایک اخبار نکالا۔(8) اس اخبار کے ذریعے سردار دیال سنگھ نے پنجاب یونیورسٹی سکیم کے خلاف بھرپور مضامین لکھے۔

انھوں نے جن دلائل کی بنیاد پر اس سکیم کو رد کیا، ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

www.rahimia.org

1۔ انگریزی کا بہ طور ایک لازمی مضمون کے ہر سطح پر شامل نہ کیا جانا۔
2۔ اعلیٰ سطح تک کی تعلیم کا صرف مقامی زبانوں میں دیا جانا۔
3۔ کالجوں کی سطح تک بھی انگریزی کے مضمون کا اختیاری کیا جانا۔
4۔ تمام اہم مضامین کی نصابی کتب تک کا نہ ہونا۔
5۔ پنجابی کا پنجاب کی ورنیکلر زبانوں میں شامل نہ کیا جانا اور ورنیکلر سے مراد صرف اردو اور ہندی کا لیا جانا۔
6۔ معیاری تراجم کا میسر نہ ہونا۔
7۔ بی۔اے اور ایم۔اے کے عنوانات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ یورپی علوم کی ڈگریاں ہیں۔ لہٰذا ان عنوانات کے ساتھ مقامی علوم کی وابستگی کا نہ ہونا اور انگریزی ڈگریاں ان کو دینا، جن کو انگریزی ہی نہ آتی ہو۔ (9)
8۔ پنجاب یونیورسٹی کالج سے پنجابی کی بنیادی ڈگری لینے والے کو ''بدھی مان'' کا عنوان دیا جاتا تھا۔ فارسی میں کم ترین درجے والے کو ''منشی'' کا عنوان دیا جاتا تھا۔ دیگر یونیورسٹیوں کے بنیادی سرٹیفکیٹ لینے والے کو Licenciate in Arts کا ٹائٹل ملتا تھا۔ ان کا اپنے نام کو ''بدھی مان'' اور ''منشی'' سے بدلنا گوارا نہ کرنے کا امکان ہے۔ (10)
9۔ مقامی زبانوں کی ترقی کے حوالے سے پنجاب یونیورسٹی کالج کے بننے کے گیارہ سال بعد بھی کوئی خاطر خواہ کردار ادا نہ کرنا۔ (11)
10۔ پنجاب والے جہالت کی گہرائیوں میں رہیں گے، اگر بنگال اور بمبئی کے انگریزی تعلیمی ثمرات سے محروم رہے۔ (12)

درحقیقت دونوں طریقہ ہائے تعلیم کا مقصد انگریزوں کی وفاداری ہی تھا۔ لہٰذا 1879ء میں لارڈ لٹن پنجاب یونیورسٹی کالج میں تقریر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کالج کے طرزِ تعلیم، یعنی مقامی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم کے لائے بغیر پنجاب کے عوام کی وفاداری کا حصول لاحاصل ہے۔ دوسری جانب انگریزی زبان کے حمایتی لکھتے ہیں:

''انگریزی زبان برطانیہ کے تمام تر احسانات میں سے اس ملک کے عوام پر سب سے بڑا احسان ہے۔ اس کے نتیجے میں قومی روح بیدار ہوئی ہے۔ اس نے ایک ایسے انقلاب کو جنم دیا ہے، جو کہ اس ملک کے طول وعرض پر ایک عظیم ندی کی طرح بہہ گیا ہے۔ جس کا اثر برطانیہ کے اس ملک پر تمام تر اثرات کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہے گا۔'' (13)

درحقیقت انگریزی تعلیم کی حمایت وہی طبقہ کر رہا تھا، جو انگریز کے سیاسی تسلط کا بھی قائل تھا۔ لہٰذا ہم سر سیّد احمد خان کو بھی دیکھتے ہیں کہ وہ نہ صرف انگریزی تعلیم کے حق میں تھے، بلکہ انگریز قوم سے بھی مرعوب تھے۔ چناں چہ سر سیّد احمد خاں اپنے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

''میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، سوداگر سے لے کر اہلِ حرفہ تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک، انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے، جیسے نہایت لائق اور خوب صورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانور کو۔ پس تم کسی جانور کو لائق ادب سمجھتے ہو؟ کچھ اس کے ساتھ اَخلاق اور بداَخلاقی کا خیال کرتے ہو؟ ہرگز نہیں کرتے۔ پس ہمارا کچھ حق نہیں (یہی وَجہ ہے) کہ انگریز ہم ہندوستانیوں کو ہندوستان میں کیوں نہ وحشی جانور کی طرح سمجھیں۔'' (14)

www.rahimia.org

مزید تحریر فرماتے ہیں:

''جو کوئی میرا ہم وطن اس تحریر کو سچی اور واقعی نہ سمجھے، آپ یقین کیجیے کہ اس کی مثال مینڈک اور مچھلی کی سی ہے۔''(15)

انگریزی ادب اور سامراجیت

انگریزی ادب اور سامراجیت کا بہت ہی اہم گٹھ جوڑ قائم رہا۔ اسی کی مدد و تعاون سے ہی برطانوی سامراج نے ہندوستان پر اپنے تسلط کو مضبوط کیا۔

اسی بات کو مزید گہرائی میں جا کر سمجھنے کے لیے ہم ان سوالوں کی کچھ مثالیں دیتے ہیں، جو انگریزی ادب کی آڑ میں پوچھے جا رہے تھے۔ جن کے ذریعے غاصب قوم کی شناخت و تہذیبی مرعوبیت کو ہندوستانی نوجوانوں کے ذہنوں میں کلاس روم کے ماحول میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ شیکسپیئر کی مثال دے کر یہ بات سمجھائی جاتی ہے کہ اس کا شہرہ بہ ظاہر تو اس بات سے تھا کہ اس نے انسانی نفسیات کو گہرائی میں سمجھا، جیسے اقبال نے بھی اس کی مدح سرائی میں لکھا:

حفظِ اَسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

مگر اس شاعر اور ڈرامہ نگار کی تحریروں کو بھی انگریز نے اپنی تہذیبی و قومی برتری ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا۔ چناں چہ 1918ء کے ڈرامے کے پرچے میں طلبا سے سوال کیا گیا کہ:

''یہ واضح کریں کہ کس طرح شیکسپیئر ایک بھرپور قومی شعور رکھتا تھا؟''(16)

اسی طرح 1907ء میں نثر کے پرچے میں سوال دیا گیا کہ:

''یہ ثابت کریں کہ سولہویں صدی کے اختتام پر انگریز قارئین کے پاس اپنی مادری زبان میں کثیر المُلکی لائبریری موجود تھی، جس میں منفرد قدیم اور جدید شاہکار موجود تھے۔''(17)

ایسے یک رُخی سوالوں کی ایک طویل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے اور ان کا مقصد سوائے اس کے اَور کیا تھا کہ مقامی ہندوستانیوں کو انگریز کی تہذیب، تاریخ، سیاست، اہم شخصیات اور بنیادی تصورات و فکر سے روشناس کرایا جائے۔ پھر ان کی مدد و تعاون سے ہندوستان میں اپنے اقتدار کی طوالت کا انتظام کیا جا سکے۔ اس تہذیبی تعارف کے عمل کو طلبا کے سامنے کلاس روم میں کیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم احتیاط یہ برتی گئی کہ نصاب میں انگریزی ادب کی موجودگی میں مقامی ادب کو قطعاً داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اس تقسیم کا ایک سیاسی ہدف تھا۔ وہ یہ کہ چوں کہ مقامی ہندوستانیوں کی شناخت کے تصور کو بدلتے ہوئے انھیں اقدامی انگریزیت کا شکار بنانا تھا، اس لیے اس عمل میں اگر ان کی اپنی تاریخ و ادب سے شناسائی بھی علمی بنیادوں پر قائم ہو جاتی تو مطلوبہ سامراجی اہداف کا حصول مشکل ہو جاتا۔ اسی وَجہ سے نہ صرف انگریزی ادب کے طلبا کو مقامی علوم سے دور رکھا جاتا، بلکہ ان کے نصاب میں کسی بھی مقامی ادب کو تراجم کی شکل میں نصاب کا حصہ بنائے جانے پر بھی ممانعت رہی۔ حال آں کہ پنجاب یونیورسٹی کے قیام سے ایک سو سال پہلے کمپنی نے مقامی ادب کے فن پاروں کے تراجم کروا لیے تھے، بلکہ یہ تراجم برطانیہ کی اعلیٰ

www.rahimia.org

ادبی شخصیات سے داد بھی وصول کر چکے تھے۔[18]

اس عمل کو کینیا کے ایک لکھاری نگوگی وا تھیانگو (Ngugi Wa Thinongo) نے کلاس روم کے نفسیاتی تشدد سے تعبیر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''تلوار اور توپ کی رات کے بعد چاک اور تختی کی صبح آئی۔ میدانِ جنگ کے جسمانی تشدد کی جگہ کلاس روم کے نفسیاتی تشدد نے لی۔ اوّل الذکر بہ ظاہر ظالمانہ تھا، مؤخر الذکر بہ ظاہر شائستہ تھا۔''[19]

چناں چہ جب مقامی کتابوں کو ان کے انگریزی تراجم کی شکل میں بھی پڑھانے کی اجازت نہ دی گئی اور نہ ہی مشرقی و مغربی علوم کو اکٹھا کیا گیا تو اس کے نتیجے میں ان شعبوں میں جو ذہن تیار ہوئے، وہ صرف مغربی علوم کی مرعوبیت کا شکار ہوئے۔ انھی ذہنوں کے ساتھ ان ''تعلیم یافتہ'' نوجوانوں کو سرکاری ملازمتیں دی گئیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان کو ''اولڈ بوائز ایسوسی ایشن'' کے ذریعے اپنے اداروں اور ان کے اساتذہ کے ساتھ جڑے رہنے کو بھی یقینی بنایا گیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی گریجویٹس یونین 1910ء میں قائم کی گئی، جب کہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج کی ''اولڈ بوائز ایسوسی ایشن'' 1906ء میں بنائی گئی۔[20]

تعلیمی نظام سیاسی نظام کے تابع

کچھ لوگوں کے نزدیک تعلیم کو بھی ایک غیر سیاسی شعبہ گردانا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ تعلیمی نظام ہمیشہ سیاسی نظام کے تابع ہی اپنے نتائج دیتا ہے۔ لہٰذا جب انگریزوں کی حکومت قائم تھی تو تعلیمی ادارے انھیں کی پالیسیوں پر چلتے تھے۔ انھی تعلیمی اداروں سے انگریز اپنے لیے فوجی تک تیار کرتے تھے۔ مثلاً پہلی جنگِ عظیم کے تناظر میں پنجاب یونیورسٹی میں سگنلز یونٹ بنائی گئی، جس میں پنجاب کے نوجوانوں کو بھرتی کیا گیا۔ اُن کو یہ لالچ دیا گیا کہ جو نوجوان کم از کم چھ ماہ جنگ میں شریک ہوں گے تو اُن کی یہ ایک سال کی تعلیم شمار ہوگی اور ان کو اگلے تعلیمی سال میں داخلہ ملے گا۔ لہٰذا جب 14/فروری 1914ء میں پرنس آف ویلز کا پنجاب یونیورسٹی کا دورہ ہوا تو یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

''ہمارے کچھ طلبا نے فرانس اور میسوپوٹیمیا (عراق) میں امتیازی خدمات سرانجام دیں ہیں۔ اور یہ کہ پنجاب یونیورسٹی سگنلز سیکشن ہندوستان کا پہلا یونیورسٹی یونٹ تھا، جس نے ملک سے باہر (جنگی) خدمات سرانجام دیں اور ہمیں ان کی کارکردگی پر فخر ہے۔''[21]

اسی تقریر میں انھوں نے مزید کہا کہ:

''یونیورسٹی ایک یونیورسٹی ٹریننگ کور کا قیام عمل میں لائے گی، جس کے نتیجے میں تعلیم یافتہ افراد فوجی تربیت کے لیے میسر ہوں گے، تاکہ وہ اپنے ملک کے دفاع کے لیے کام کر سکیں۔''[22]

اسی طرح جو نوجوان طالبِ علم انگریزوں کی حکمرانی و ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے تھے، ان کو بھی اس آزادیٔ اظہارِ رائے کا خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا۔ اسی حوالے سے ابھی حالیہ منظر عام پر آنے والی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ لاہور کے تعلیمی اداروں کے سینکڑوں نوجوانوں کو جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کے خلاف آواز بلند کرنے کی پاداش میں تعلیمی اداروں سے نکال باہر کیا گیا۔[23]

قیامِ پاکستان کے بعد انگریزی ادب کا نصاب

جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو ایک آزاد قوم کے نقطۂ نظر سے جو تبدیلیاں لائی جانی چاہئیں تھیں، وہ یہاں کے تعلیمی نصاب میں نہیں لائی گئیں۔ انگریزی ادب کا وہ نصاب جس کا آغاز برطانیہ کے قومی مفادات کے تابع لندن یونیورسٹی میں کیا گیا تھا، جو بعد میں سامراجی مفادات کے تحت ہندوستان میں متعارف کروایا گیا اور اس کی مقامی لوگوں کی شناختوں کو تبدیل کرنے اور وفادار طبقات پیدا کرنے کے نقطہ نظر سے افادیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ادارہ جاتی حیثیت کو منظّم کیا، اسی نصاب کو پاکستان میں رائج رکھا گیا۔ اس کا نتیجہ بھی یہی ہوا کہ وطنِ عزیز کے قومی تقاضوں سے بے بہرہ، مغربی مرعوبیت کا شکار ''تعلیمی'' طبقات تیار ہوتے چلے گئے۔ انگریزی تعلیم کے بارے میں دنیا کے بہت سے ممالک کے پروفیسر شا کی نظر آتے ہیں۔ مثلاً کینیا کے انگریزی کے ایک استاد اور مصنف نگوگی تھیانگو نے 1972ء میں یہ تجویز پیش کی کہ:

> ''انگریزی ادب کے شعبے کو افریقا کی یونیورسٹیوں میں نہیں پڑھایا جانا چاہیے۔ انگریزی زبان و ادب کے شعبہ جات کو ختم کر کے ان کی جگہ پر افریقی زبان و ادب کے شعبہ جات قائم کیے جائیں۔''[(24)]

انھوں نے اس تجویز میں واضح کیا کہ انگریزی ادب کے پڑھائے جانے کا آغاز افریقی غلامی اور افریقا پر یورپ کے تسلط کے نتیجے میں ہوا۔ چوں کہ اب یہ تسلط ختم ہو چکا ہے، اس لیے اس ادب کو پڑھنے پڑھانے کا جواز بھی ختم ہو گیا ہے۔ کیوں کہ افریقا کے کلچر کا یورپی، یونانی کلچر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مگر پاکستان بننے کے بعد یہاں کے انگریزی ادب کے نصاب میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ جس نصاب کا آغاز ہندوستان میں انگریز کے تسلط کو مستحکم کرنے کے لیے ہوا تھا، یا خود برطانیہ میں جس کا آغاز اپنے قومی ذہن تک رسائی کے اصول پر ہوا تھا، اس کو بلا کسی مرحلہ وار تنقیدی عمل سے گزارے ایک نئی آزاد قوم نے اپنا لیا۔ لہٰذا اس نصاب سے جو فائدہ انگریز قوم نے اپنے لیے حاصل کیا تھا، بلا سوچے سمجھے جب ہم نے اس کو رائج کیا تو یہاں بھی اس نصاب نے وہی نتائج دیے۔ وہ وژن جو ٹی۔ بی۔ میکالے کا تھا، اس کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں:

> ''ایک ایسا طبقہ تیار کیا جائے، جو رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر ذوق، سوچ، رائے اور اَخلاق کے حوالے سے انگریز ہو۔''[(25)]

حتیٰ کہ 1970ء کی دہائی میں جب اس خطے میں امریکی اثر کا اضافہ ہو رہا تھا اور اگلے درجے میں افغانستان میں روس کی پیش قدمی کو روکنا تھا تو انگریزی ادب کے شعبے میں امریکی ادب کو بھی پڑھائے جانے کا آغاز ہوا۔ امریکی سامراج کے بین الاقوامی تسلط کا بھی دنیا میں امریکی ادب کے پھیلنے سے گہرا تعلق ہے۔ اسی تعلق پر ''میگ ویسلنگ'' کی ایک مستقل کتاب بھی موجود ہے، جس میں انھوں نے فلپائنز میں امریکی سامراجیت اور امریکی ادب کے گٹھ جوڑ کو تحقیقی انداز میں بیان کیا ہے۔[(26)]

حقیقتِ حال

حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن کے 2017ء کے نصاب میں پہلی بار انگریزی ادب و زبان کے شعبہ جات میں

www.rahimia.org

انگریزی و امریکی مرکزیت کو ایک مسئلے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے حل کے لیے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ مقامی، ریجنل اور گلوبل ادب کو بھی اس شعبے میں جگہ دی جائے۔ چناں چہ اس نصاب کے مطابق اب انگریزی شعبہ جات کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ پاکستانی انگریزی ادب، جنوبی ایشیائی (انگریزی) ادب، ٹرانسلیشن سٹڈیز، افریقی ادب، پاکستانی لوک ادب، اسلام اور مغربی ادب جیسے کورسز پڑھائیں۔ [27] یہ اقدام یقیناً خوش آئند ہے، مگر جب ہم مجوزہ کورسز کا گہرائی میں تجزیہ کرتے ہیں، وہ یہ نظر آتا ہے کہ چوں کہ اس شعبے کی بنیاد کالونیل دور میں رکھی گئی ہے، لہٰذا ابھی تک مرکزی حیثیت یورپی مصدقہ کتب وتصورات کو ہی حاصل ہے۔

اس پسِ نوآبادیاتی (Neo-colonial) مسئلے کے حوالے سے ایک اہم نقطہ نظر گلوبل ساؤتھ یا عالمگیر جنوب کی ردِ نوآبادیات کی علمی تحریک (Decolonial Movement) کا ہے۔ جن کا یہ کہنا ہے کہ دنیا بھر کے وہ معاشرے جو کالونیلائزیشن کا شکار رہے ہیں، ان کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ یورپی علم سے مکمل طور پر لاتعلقی اختیار کریں۔ وہ اس عمل کو ''ایپسیٹیمک ڈی لنکنگ'' (epistemic delinking) سے تعبیر کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کا کہنا یہ ہے کہ عالمگیر جنوب (Global South) میں از سرِ نو علم کی تدوین ضروری ہے۔ یہ تدوین ردِ نوآبادیاتی نقطہ نظر سے ہونا اہم ہے۔ اس کی بنیاد مقامی علوم ہی ہو سکتے ہیں۔ [28]

اگر ہم اس نقطہ نظر سے جائزہ لیں تو نہ صرف انگریزی ادب کا شعبہ، بلکہ ہماری یونیورسٹیوں کے بہت سے ایسے شعبے ہیں، خصوصاً سماجی علوم اور انسانیات (Humanities and Social Sciences) کے شعبے، جو ابھی تک یورپ و امریکا مرکزیت کا بری طرح شکار ہیں۔ سماجی علوم میں سیاسیات، معاشیات، مینجمنٹ سائنسز، ابلاغی علوم، ادب، آرٹس اینڈ ڈیزائن، تاریخ، فلسفہ، کلچرل علوم، اینتھرو پالوجی، سائیکالوجی وغیرہ تمام شعبہ جات کی بنیاد یورپ مرکزیّت (Euro-centric) فکر پر قائم ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ تمام علم جو مقامی معاشروں نے پیدا کیا، اس کو متروک قرار دے دیا گیا۔ نصاب اور یونیورسٹی میں اس کی کوئی جگہ نہ رکھی گئی۔ ایسے تمام علوم کو جدیدیت (Modernism) سے پہلے کے علوم کو 'مذہبی' علوم قرار دے کر ان پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا گیا۔

اس تناظر میں اس بات کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے کہ نہ صرف انگریزی ادب کا شعبہ، بلکہ وہ تمام شعبہ جات جن کا آغاز نوآبادیاتی دور میں ہوا، یا نوآبادیاتی علوم کے زیرِ اثر ہوا، ان کا از سرِ نو تجزیہ کیا جائے۔ ایسے تمام علوم جن کو نوآبادیاتی خواہشات کے تحت دبا دیا گیا تھا، یا حاشیے میں دھکیل دیا گیا تھا، ان کو دوبارہ سمجھا جائے۔ اگر وہ انسان دوستی کے اصول سے ہم آہنگ ہوں تو انھیں قومی انسانی وعصری تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے دوبارہ جانچنا نہایت ضروری ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں اس بات کی انتہائی ضرورت ہے کہ تحقیق کو بامقصد بنایا جائے۔ اس تناظر میں حقائق کو سامنے لایا جائے اور اعلیٰ تعلیم کو نئے آزادانہ پیراڈائم میں از سرِ نو منظّم کیا جائے۔

حوالہ جات وحواشی

1. "...culture is a sort of theatre where various political and ideological causes engage one another." (xiii) Said. Edward. Culture and Imperialism. New York: Vintage, 1993.
2. "The main battle in imperialism is over land, of course; but when it came to who owned the land, who had the right to settle and work on it, who kept it going, who won it back, and who now

www.rahimia.org

plans its future--these issues were reflected, contested, and even for a time decided in narrative."

Said. Edward. Culture and Imperialism, xii–xiii, New York: Vintage, 1993.

3. Palmer, D. J. The Rise of English Studies, P.25, Oxford: Oxford University Press, 1965.
4. Johnson, Kirstin Jeffery. "Rooted in all its story, more is meant than meets the ear: A Study of the Relational and Revelational Nature of George MacDonald's Mythopoeic Art." P.87, PhD Diss. Univ. of St. Andrews, 2011.
5. Doyle, Brian. English and Englishness, P.22-23, Oxon: Routledge. 1989.
6. "Shakespeare, …, is full of religion…. Sound protestant Bible Principles, though not actually told in words, are there set out to advantage, and the opposite often condemned. So with Goldsmith, Abercombie on Mental Powers, and many other books which are taught in the schools; though the natives hear they are not to be proselytized, yet such books have undoubtedly sometimes a favourable effect in actually bringing them to us missionaries." (Rev. Keanes qtd in Vishwanathan 122)

   Viswanathan, Gauri. Masks of Conquest: Literary Study and British Rule in India. London: Faber & Faber. 1989
7. Bruce. F.L. A History of the University of the Panjab, P.9, Lahore, 1933.
8. Wikipedia contributors. "The Tribune (Chandigarh)." Wikipedia, The Free Encyclopedia. Wikipedia, The Free Encyclopedia, 19 Aug. 2019. Web. 12 Sep. 2019.
9. Majithia, Dyal Singh. "Education in the Punjab-"II. P.12-13, February 9, 1881. The Tribune. Pp 1-5. Eds. F.M. Bhatti, Qalb-i-Abid, Massarrat Abid. Sardar Dyal Singh Majithia: The Establishment of Punjab University, Lahore: Research Society of Pakistan. 2012.
10. Majithia, Dyal Singh. "Education in the Punjab-III." P.12, February 16, 1881. The Tribune. Pp 6-10. Eds. F.M. Bhatti, Qalb-i-Abid, Massarrat Abid. Sardar Dyal Singh Majithia: The Establishment of Punjab University. Lahore: Research Society of Pakistan. 2012.
11. Majithia, Dyal Singh. "Education in the Punjab-V." P.28, March 5, 1881. The Tribune. Pp 11-15. Eds. F.M. Bhatti, Qalb-i-Abid, Massarrat Abid. Sardar Dyal Singh Majithia: The Establishment of Punjab University. Lahore: Research Society of Pakistan. 2012.
12. Majithia, Dyal Singh. "Education in the Punjab-VIII." P.17, April 23, 1881. The Tribune. Pp 26-31
13. Majithia, Dyal Singh. "Education in the Punjab-VI." P.90, March 19, 1881. The Tribune. Pp 16-20
14. Majithia, Dyal Singh. "Education in the Punjab-VIII." P.153-54, August 6, 1881. The Tribune. Pp 82-85
15. "English education is the greatest boon conferred by England upon the people of this country. It has stirred up the national soul. It has given birth to a revolution which has spread like a mighty torrent over the whole face of the country, and whose influences will survive every vestige of British power in the country." (90) - Majithia, Dyal Singh. "Education in the Punjab-VIII." P.154, August 6, 1881. The Tribune. Pp 86-91
16. Punjab University Calendar 1918-1919 "Shakespeare had a keen sense of national character"?. P. cccxxxii
17. "English readers before the close of the sixteenth century were in possession of a cosmopolitan library in their mother tongue, including choice specimens of ancient and modern masterpieces." Illustrate this statement fully (Punjab University Calendar 1907-08), P. cxcix

www.rahmia.org

18. Khawaja, Waqas. Sir William Jones in India: (Con)textualizing a Colony. Unpublished paper. PDF File.
19. Wa Thingo, Ngugi. Decolonizing the Mind. London: Hienemann, 1986.

20۔ سعید احمد، اسلامیہ کالج کی صد سالہ تاریخ، ص 281، لاہور۔

21. Punjab University Calendar 1921-1922. "some of our former students served with distinction in France and Mesopotamia" [and that] "The Panjab University Signals section was the first Indian University Unit to serve abroad, and we are proud of their performance." In his address, he also added that the university is organizing "the University Training Corps" which would then make available "men of education" for military training so that they may "serve in their country's defence if need arise." P. 566.

22۔ ایضاً۔

23. Martial Law Order No. 36. Archived at the Punjab Archives Department.
24. Ngugi Wa Thiong'o. On the Abolition of the English Department. 1972. PDF.
25. Macaulay's Minute. PDF
26. Wesling. Meg. Empire's Proxy: American Literature and US Imperialism in the Philippines. New York: NYU Press, 2011
27. Curriculum [of] English, BS and M.Phil. 2017. Higher Education Commission of Pakistan.
27. Mignolo, Walter D. "Epistemic Disobedience, Independent Thought and De-Colonial Freedom." Theory, Culture and Society. 2009. Pp 1-23.

☆

www.rahimia.org

مطالعۂ قرآنیات

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی قرآنی خدمات کا جائزہ

تحریر: رشید احمد

بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کی آخری امید ''خلافتِ عثمانیہ'' [1] ہچکولے لے رہی تھی۔ اس تناظر میں عالم اسلام اور بالخصوص اسلامیانِ برصغیر کو جو چیلنجز درپیش تھے، ان میں جہاں مسلمانوں اور برصغیر کے عوام کو منظّم کرنا تھا وہیں انھیں بیسویں صدی کے جدید عمرانی و سیاسی، صنعتی ومعاشی تقاضوں سے بھی آگاہ کرنا تھا۔ بادشاہی نظام دنیا سے رخصت ہو رہا تھا۔ نئے سماج کی تشکیل ادارہ جاتی عمل کی بنیادوں پر ہونے جا رہی تھی۔ سیاسی حوالے سے قومی جمہوری تصورات، معاشی حوالے سے مشین کے استعمالات اور اجتماعی و ادارہ جاتی معیشت کے تصورات ارتقا پذیر تھے۔ اسی طرح مذہبی تعلیم اور عصری تعلیم کے حاملین کو ایک نظم میں ڈھال کر یک جا کرنا، سماجی تشکیلِ نو کے لیے ایک ضروری اور ناگزیر عمل تھا۔

انسانی سماج ارتقا پذیر ہے۔ اس کے گردو پیش کا ماحول اس سے تقاضا کرتا ہے کہ معاشرے کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق تشکیل دیا جائے۔ اس کے لیے نئی سے نئی شریعتیں آئیں اور انبیا تشریف لاتے رہے۔ حضور اکرم ﷺ نے پچھلی تمام شریعتوں کو منسوخ کر کے نئے سماج کی تشکیل نئی شریعت پر کی۔ اسی کے لیے حضور اکرمؐ نے اجتہاد کی طرف رہنمائی فرمائی اور دین کی تجدید کرنے والے مجددین کی آمد کا بتلایا۔ جیسے کسی زمانے میں بادشاہی نظام معاشرے کے مسائل کے حل میں درست کردار ادا کرتا تھا، لیکن مرورِ زمانہ سے یہ مسائل کے حل کے بجائے خود ایک مسئلہ بن گیا، جس کے لیے ایک نئے بندوبست کی ضرورت پڑی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ [2] کے سلسلۂ فکر کے حاملین [3] قرآن حکیم، سیرت رسولؐ، سیرت جماعتِ رسول اور ہزار انسانی سالہ فکر کے ارتقا کے اساسی اصولوں [4] پر نئے سماج کی تشکیل کے لیے جدوجہد میں مصروف تھے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی تھی، جن کی قرآنی خدمات یہاں زیر بحث لائی گئی ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور نظارۃ المعارف القرآنیہ

''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کا قیام 13/جون 1913ء کو متحدہ ہندوستان کے شہر دہلی میں عمل میں لایا گیا۔ [5] اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ برصغیر کے قومی اور بین الاقوامی حالات [6] کے تناظر میں عصری و مذہبی علوم کے فاضل حضرات کو ایک مرکز پر اکٹھا کیا جائے۔ ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی جائے اور ولی اللّٰہی فلسفہ وحکمت پر ہندوستان کے معروضی حالات میں سیاسی تربیت دی جائے، تاکہ قومی جدوجہد کے حوالے سے عصری ومذہبی علوم سے وابستہ نوجوانوں میں شعور وآگہی پیدا کر کے ہندوستان کو ایک مؤثر قیادت فراہم کی جائے۔ [7]

نظارۃ المعارف کے بانی شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ [8] نے ایک طرف شاہ عبدالقادر دہلویؒ [9] کے اُردو ترجمہ قرآن [10] پر نظر

ثانی کرکے اسے اس دور کی رائج زبان میں پیش کیا، جو ''موضح الفرقان'' کے نام سے موسوم ہے۔ دوسری طرف امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اصولِ تفسیر اور قرآنی فکر و فلسفے کو ہندوستان کی دو علمی تحریکوں؛ دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج کے طلبا میں منتقل کرنے، ان اداروں کے طلبا میں ہم آہنگی پیدا کرنے، قرآنی افکار کی ترویج اور غلبہ دین کی قرآنی حکمت پر تربیت کے لیے ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' [11] قائم کی۔ [12] شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اپنے بااعتماد شاگرد مولانا عبید اللہ سندھیؒ [13] کو نظارۃ المعارف کی ذمہ داری سونپی۔ [14]

مولانا عبیداللہ سندھیؒ (1944-1872ء) ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں چیاں والی میں پیدا ہوئے۔ سکھ مذہب میں آپ کا نام بوٹا سنگھ ولد رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے تھا۔ 1887ء میں مڈل کی تیسری جماعت (یعنی ہشتم) میں پڑھتے تھے کہ اظہارِ اسلام کے لیے گھر چھوڑ دیا۔ سندھ کے صوفی بزرگ حضرت حافظ محمد صدیق صاحبؒ [15] بھرچونڈی شریف کے ہاتھ پر قادری راشدی طریقے پر بیعتِ طریقت کی۔ 1888ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ تعلیمی مراحل طے کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے دروس میں شامل ہوگئے۔ 1890ء میں سالانہ امتحان میں دینی علوم کی تکمیل کی سند حاصل کی۔ 1891ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے اجازتِ تدریس تحریر فرمادی۔ 1891ء سے 1909ء تک سندھ میں تدریس، تصنیف، اشاعت، دعوت و ارشاد میں مصروفِ عمل رہے۔ [16]

مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے دارالعلوم دیوبند میں قیام کے دوران شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن ''موضح الفرقان'' کے سلسلے میں حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی نشستوں سے استفادہ کیا اور ترجمہ قرآن کے بنیادی اسلوب سے آگہی حاصل کی۔ 1902ء میں قرآنی علوم کی ترویج کے لیے دارالرشاد کے نام سے گوٹھ پیر جھنڈا (حیدرآباد، سندھ) میں ایک ادارہ قائم کیا۔ شیخ ابوالحسن تاج محمود امروٹیؒ [17] کے ساتھ سندھی زبان میں ترجمہ قرآن حکیم میں معاونت کی اور اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ آپؒ 1909ء میں شیخ الہندؒ کی قائم کردہ جمعیت الانصار کے ناظم اعلیٰ بنے اور قرآنی علوم کے پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کیا۔ 1913ء میں نظارۃ المعارف القرآنیہ کے ناظم اعلیٰ بنے۔ [18]

نظارۃ المعارف القرآنیہ کی سرپرستی درجِ ذیل حضرات فرما رہے تھے: [19]

1۔ مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ [20]

2۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ

3۔ مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ [21]

4۔ نواب وقارالملکؒ [22]

5۔ حکیم اجمل خانؒ [23]

6۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ [24]

نظارۃ المعارف القرآنیہ کے قیام کے لیے جگہ کا انتخاب دہلی کی تاریخی مسجد فتح پوری [25] میں کیا گیا۔ فتح پوری مسجد سے ملحق شمالی کمروں کو درس گاہ کے طور پر استعمال میں لایا گیا۔ [26]

www.rahmia.org

نظارۃ المعارف کے قیام کے بنیادی مقاصد

مؤسّسینِ نظارۃ المعارف القرآنیہ کے پیشِ نظر حسبِ ذیل بنیادی مقاصد تھے:

1۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو قرآنِ مجید پڑھانا۔
2۔ اسلامی مکاتیب، مدارس، سکول اور کالجوں میں معلّمینِ قرآن تیار کرنا۔
3۔ قرآنِ حکیم کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرانا۔
4۔ قرآن شریف کے مضامین کو عام فہم بنانا، اور ان کی اشاعت و ترویج کے لیے تمام ممکنہ وسائل عمل میں لانا۔
5۔ قرآنِ حکیم پر غیر مسلموں کے اعتراضات کا تحریراً و تقریراً جواب دینا۔
6۔ عربی دان گریجویٹس کو ایک سال میں پورا قرآنِ حکیم اور ''حجۃ اللہ البالغہ'' [27] پڑھانا۔ اس کے ساتھ ساتھ ام الصحاح مؤطا امام مالک [28] مع شرح شاہ ولی اللہ [29] کو پڑھانا۔ نیز بخاری، [30] مسلم [31] اور ترمذی [32] کے اس قدر حصص پڑھانا، جس سے طلبا ان کتب سے واقف ہو جائیں۔ [33]

شیخ الہندؒ کی تحریک؛ علمی، سیاسی و سماجی جدوجہد سے معمور تھی، جس نے برصغیر کے سماج پر گہرے نقوش مرتب کیے تھے۔ مولانا سندھیؒ اپنے مربی اور استاذ کی اس جدوجہد میں ہمہ تن شریکِ کار تھے۔ آپؒ نظارۃ المعارف میں 1915ء تک مصروفِ عمل رہے۔ پھر اپنے استاذ کے حکم پر افغانستان روانہ ہو گئے۔ [34]

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے مطالعہ قرآن کے اصول

مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے نظارۃ المعارف القرآنیہ میں قرآنی تعلیم اور مطالعہ قرآن کے لیے کچھ بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھا، جو کتاب کی صورت میں موجود ہیں۔ جس میں مولانا عبید اللہ سندھی نے قرآن کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس طرف متوجہ کیا ہے کہ سماج پر مطالعہ قرآن کے نتیجے میں اجتماعی اثرات کیا مرتب ہونے چاہئیں؟ چناں چہ آپؒ نے قرآن کے اعجاز اور اس کی تاثیر کو پیش نظر رکھ کر اصول مطالعۂ قرآن پیش کیے، [35] جس میں بنیادی اصول نمونہ کے طور پر حسب ذیل پیش کیے گئے ہیں:

1۔ قرآن تدبر کی دعوت دیتا ہے اور اس پر معاشرتی تشکیل کی بات کرتا ہے

مولاناؒ کے نزدیک مسلمان قرآن جیسی اعلیٰ کتاب کے ہوتے ہوئے معاشرتی پستی کا شکار ہیں، جس کی بنیادی وجہ قرآن پر تدبر نہ کرنا ہے۔ اس دور میں جسے تدبر کہا، یا سمجھا جا رہا ہے، وہ تدبرِ قرآن کے نام پر مختلف تفاسیر اور ان کی شروح پر تدبر ہے، جو اپنے دور کے مخصوص تقاضوں کے تناظر میں لکھی گئیں۔ جن کا بیسویں صدی کے تقاضوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ [36]

سورۃ المزمل کی آیت ''وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ۝۴'' [37] (اور کھول کھول کر پڑھ قرآن کو صاف) کی تشریح میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ:

''قرآن حکیم کو سمجھ کر پڑھنے کی اتنی اہمیت اور تاکید خود قرآن حکیم کے بیان کرنے کے باوجود مسلمانوں نے غور و فکر کے بغیر اور عقل کو ایک طرف رکھ کر پڑھنے کے عمل کو کیسے کافی سمجھ لیا؟ نہ معلوم کس زمانے میں مسلمانوں میں

یہ خیال پیدا کر دیا گیا کہ قرآن کا مطلب سمجھے بغیر صرف حلق سے ''ح'' نکالنا یا شین، قاف کو درست کر کے پڑھنے کا نام ترتیل ہے۔''[38]

2۔مطالعہ قرآن میں روحِ عصر کو پیشِ نظر رکھنا ضروری اور لازمی عمل ہے۔

مولانا سندھیؒ کا کہنا ہے کہ مطالعہ قرآن کے بنیادی اصولوں میں روحِ عصر، یعنی ہر دور کے بنیادی تقاضوں اور موجودہ زمانے کے حالات کا ادراک اور معاشروں میں وقوع پذیر بنیادی تبدیلیوں سے آگاہی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔قرآن حکیم کی بہت سی آیات ہمیں اس طرف متوجہ کرتی ہیں کہ قرآن کے اوّلین مخاطب؛ عرب معاشرے کو اس دور کے حالات کی طرف کس طرح متوجہ کیا گیا۔اس تناظر میں بیسویں صدی کی اہم تبدیلیوں کو نظر انداز کرنا اور اس کے معاشروں پر اثرات سے پہلو تہی کیسے مناسب عمل ہوسکتا ہے؟[39]

سورۃ العصر کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ:

''عصر کے معنی ہیں وقت، جس کے ساتھ گزرنے کا تصور بھی ہو، یعنی گزرنے والا زمانہ۔''[40]

یہ زمانہ کوئی ٹھہری ہوئی چیز نہیں، بلکہ یہ متبدل ہے۔ جو قوم روحِ عصر کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کرتی رہی ہے، وہ عروج پر چلی گئی۔جس قوم نے رجعت پسندی اختیار کی، یا تو وہ زمانے سے بہت پیچھے چلے گئے، یا وقت گزرنے کے ساتھ ان کے تمدن مٹ گئے۔اگر ان میں انسانیت سرے سے مفقود ہوگئی تو ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔

3۔قرآن کو پڑھتے وقت اس کا مقصد پیش نظر رکھنا ناگزیر عمل ہے، جیسا کہ قرآن حکیم نے انبیا علیہم السلام کی بعثت کے مقاصد واضح کیے ہیں۔

مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص قرآن حکیم پڑھے، لیکن اس کے پڑھنے کا مقصد اس کے سامنے نہ ہو، وہ اپنے اندر اس کے اثرات نہیں پیدا کر سکے گا۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ قرآن کو مانتا ہو، لیکن اس کا عمل اس کے خلاف ہو۔قرآن کے ساتھ بے شعوری کا تعلق، یا اس پر غور وفکر اور تدبر نہ کرنے سے اس کے معاشرے میں کوئی اثرات ونتائج پیدا نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ ہر عمل اپنا ایک نتیجہ رکھتا ہے۔قرآن حکیم کی تعلیم بھی معاشرے میں اپنا اثر پیدا کرنا چاہتی ہے۔[41] اسی تناظر میں مولانا سندھیؒ بعثتِ انبیاؑ کے مقاصد کا تعین کرتے ہیں اور اسے ہر دور کے لیے مشعلِ راہ قرار دیتے ہیں۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ[42]

(ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اُتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو، تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر۔)

بعثتِ انبیاؑ کے مقاصد پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ:

''وہ وقت کسی نئی حکومت کے ظاہر ہونے اور پہلی حکومت کے برباد ہونے کا ہوگا۔ پھر اس وقت اللہ تعالیٰ ایسا رسول بھیجے گا، جو اس نئی حکومت کا دین یا قانون قائم کرے گا اور پرانی حکومت برباد ہوگی۔یعنی انبیا علیہم السلام کی بعثت اس وقت ہوتی ہے، جب معاشرے بگاڑ کا شکار ہوجائیں، انسانیت اعلیٰ اخلاق سے گر کر حیوانیت پر آجائے،

www.rahimia.org

تمدن فاسد ہو جائیں۔ ایسے میں انبیاؑ اللہ کی شریعت کی روشنی میں معاشرے کو نیا قانون دیتے ہیں۔'' (43)

مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ یہ فقط قرآن مجید کی تعلیم کا اثر تھا کہ چند سال کے عرصے میں عرب کے بُت پرست اور جاہل لوگ دنیا میں سب سے زیادہ خدا پرست، سب سے زیادہ متمدن، سب سے زیادہ مہذب اور سب سے زیادہ طاقت ور بن گئے۔ اسی قرآن کی تعلیم نے ان میں نہایت جلد ایسے کامل ترین اخلاق پیدا کر دیے کہ اگر ایک طرف چند سال کے عرصے میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنتوں نے متفقہ طور سے ان کے سامنے سرِاطاعت خم کر دیا تھا تو دوسری طرف وہ سب سے زیادہ خدا پرست بن گئے تھے۔ (44)

4۔ قصصِ قرآن کا مقصد واقعاتِ تاریخ سے فائدہ اٹھا کر ان کو شمعِ ہدایت بنانا ہے۔

مولانا سندھیؒ کے مطالعہ قرآن میں قصصِ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ باشعور انسان ان واقعاتِ تاریخ سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے لیے ان کو شمعِ ہدایت بنائیں۔ انبیاؑ اور صلحا کے نقشِ قدم پر چل کر پوری کامیابی حاصل کریں۔ یہ صرف قصہ کہانیاں نہیں ہیں۔ قرآن حکیم نے قصۂ یوسفؑ کو ''احسن القصص'' قرار دیا ہے، لیکن اس کو یوسف و زلیخا کا قصۂ عشق بنا دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں اس کے سیاسی و معاشی مقاصد پنہاں ہو گئے۔ (45) یوسفؑ اپنے رب کے انعامات کا ذکر کرتے ہیں۔

مولانا سندھیؒ آیت ''رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ'' (46) (اے میرے پروردگار! تو نے مجھے حکومت میں سے حصہ دیا) سے مقصد اخذ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اپنے مقصد کو نہ چھوڑنا اور ہر حال میں کام جاری رکھنا' خواہ آزادی ہو یا نہ ہو، یہ نہایت عمدہ سبق ہے۔ اسی جہدِ مسلسل اور اپنے مقصد کو مقدم رکھنے کا نتیجہ ہے کہ یوسفؑ ایک اجنبی ملک میں غلامی کے درجے سے ترقی کے اس درجے تک پہنچے کہ وہ حکومت کرنے لگے۔ (47)

قصصِ قرآن ہر دور کے لیے ہیں کہ جو لوگ بھی ان قصص کی تعلیم سے فائدہ اٹھائیں گے اور ان پر عمل کریں گے، وہ دنیا کی بہترین قوم بن سکتے ہیں۔ اس تناظر میں قرونِ اولیٰ بہترین نمونہ ہے۔ مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ:

> ''قرآن کے ایک حصے کے تو ہم نے معنی بدل دیے، ایک حصہ ہم نے بھلا دیا اور ایک حصے کی تعلیم کو ہم نے کہانیوں کا درجہ دے رکھا ہے اور اس سے ہم مستفید ہونے کی کوشش نہیں کرتے تو پھر کون سی تعجب کی بات ہے کہ اب قرآن سے وہ نتیجے پیدا نہیں ہوتے جو ہونے چاہئیں اور جو صحابہؓ کے زمانے میں ہو چکے ہیں۔'' (48)

5۔ قرآنی اصطلاحات و الفاظ اپنے اندر معنویت رکھتے ہیں، جنھیں درست تناظر میں سمجھنا ضروری ہے۔

مولانا سندھیؒ کا رُجحانِ فکر یہ تھا کہ اصل قرآن کو پیشِ نظر رکھا جانا ضروری ہے۔ محض تراجم یا تفاسیر کو پیشِ نظر رکھ کر قرآن حکیم کی تشریح پیش کرنے سے قرآنی الفاظ کی جو وسعت ہے، اس سے دوری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ غلط مفہوم رائج ہو گئے۔ دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ مفسر نے جس چیز پر زور دیا ہوتا ہے، اس پر زیادہ توجہ چلی جاتی ہے، جس سے قرآن کے اہم حصے نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ یوں اصل کتاب سامنے ہونے کے بجائے دیگر مطبوعہ چیزیں ہی پیشِ نظر رہیں تو قرآن کی حقیقت، اس کی اصل تعلیم سامنے نہیں آئے گی اور قرآن کی آفاقیت پس منظر میں چلی جائے گی۔ (49)

مثلاً ''دعا'' کا مفہوم یہ تصور ہوتا ہے کہ بغیر کچھ کیے اللہ سے مانگنا اور یہ تصور کر لینا کہ اللہ خود بہ خود عطا کر دیں گے۔ گویا دعا

www.rahimia.org

بےعملی کا نام بن گیا۔ نواب محسن الملک [50] کہتے ہیں کہ جب مسلمانوں میں کچھ جان تھی تو ان میں وعدہ اور قول وقرار کا دوسرا مفہوم تھا۔ جب ان پر مردنی چھا گئی تو انھیں الفاظ کا دوسرا مفہوم ہوگیا۔ پہلے یہ مشہور تھا: قولِ مرداں جانے دارد۔ پھر یہ حالت ہوئی؛ وعدہ آساں ہے، اس کی وفا مشکل ہے۔ پھر اس کے بعد یہ حالت ہوگئی؛ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوگیا۔ [51] اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ وعدے قرآن حدیث ہوتے ہیں کیا؟ جوتوڑے نہیں جاسکتے (جملہ معترضہ)۔

مولانا سندھیؒ سورۃ فاتحہ کی آیت ''اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ‏'' [52] (بتلا ہم کو سیدھی راہ) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ دعا سے مراد اس ارادے کا اظہار ہے، جو ہم اپنے دل میں بناتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہم عمل کریں گے، ہم اس راہ میں اپنی تمام قوتیں صرف کردیں گے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس راہ میں رکاوٹیں پیش آئیں گی۔ اس وقت ہم اپنے اللہ سے جو ربّ رحمٰن و رحیم اور مالک وقادر ہے، درخواست کریں گے کہ وہ ان رکاوٹوں کو ہمارے راستے سے دور فرمانے میں ہماری مدد کرے۔ یہاں تک کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں۔ ان معنوں میں دعا عمل کے دوران درپیش رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے مددِ الٰہی کو چاہنے کا نام ہے۔ [53]

مولانا سندھیؒ کی تفسیری خدمات اور لسانی تنوع

مولانا عبیداللہ سندھیؒ 1915ء میں شیخ الہندؒ کے حکم پر جدجہدِ آزادی کے سلسلے میں افغانستان گئے۔ افغانستان میں آپؒ کے شاگرد ظفرحسن ایبک [54] نے ''الدّین و السّیاسة فی القرآن'' کے عنوان سے آپؒ کے دروسِ قرانیہ کو قلم بند کیا۔ [55] 1922ء میں روس گئے۔ [56] ماسکو میں اشتراکیت [57] کا بہ غور مطالعہ کیا۔ [58] 1923ء میں ترکی تشریف لے گئے۔ یہاں ترکی میں آنے والے انقلاب [59] کا مطالعہ کیا۔ [60] 1926ء میں ترکی سے حجاز کے لیے روانہ ہوئے۔ [61] 1926ء سے 1939ء تک حجاز میں رہے، جہاں بیٹھ کر آپؒ نے دنیا بھر کے انقلابات — جن کا مشاہدہ آپؒ براہِ راست کرچکے تھے — ان کا تجزیہ کیا۔ [62] حجاز میں قیام کے دوران اور ہندوستان واپسی پر آپؒ نے اپنے شاگردوں کو تفسیری دروس دیے، جن کو انھوں نے اپنے الفاظ اور تعبیرات کے ساتھ محفوظ کیا۔ جن میں سے 4 معروف تفاسیر ''الھام الرّحمٰن'' (عربی زبان میں)، ''القاء المنان فی تفسیر القرآن'' (سندھی زبان میں)، ''المقام المحمودؔ'' اور ''قرآنی شعورِ انقلاب'' (اردو زبان میں) ہیں۔ مختلف زبانوں میں چار تفاسیر کو پیش کرنا مولانا سندھیؒ کی خصوصیت ہے۔ تفاسیر کی تفصیلات حسبِ ذیل ہیں۔

i۔ تفسیر الہام الرحمٰن

مولانا سندھیؒ روس میں تھے تو گورنمنٹ نے آپ کو لینن گراڈ (موجودہ نام؛ سینٹ پیٹرز برگ) کی سیر کی پیش کش کی تو آپؒ نے قبول کرلی، لیکن آپؒ نے قیام کے لیے مولانا موسیٰ جاراللہؒ [63] کے گھر کا انتخاب کیا۔ مولانا موسیٰ جاراللہ بہت بڑے عالمِ دین تھے۔ اس وقت تک ان کی ڈھائی سو تصنیفات قاہرہ سے شائع ہوچکی تھیں۔ مولانا موسیٰ جاراللہؒ مولانا سندھیؒ سے بہت زیادہ متأثر ہوئے۔ انھوں نے مولانا سندھیؒ سے ولی اللّٰہی فلاسفی کو سمجھا۔ جب مولاناؒ حجاز میں مقیم تھے، اس وقت آپؒ سے قرآن حکیم کی تفسیر ولی اللّٰہی حکمت کی روشنی میں پڑھی اور اسے عربی میں قلم بند کیا۔ اس تفسیر کو ''الہام الرحمٰن'' کا نام دیا۔ اس تفسیر میں

www.rahimia.org

جہاں مولانا سندھیؒ کے افادات ہیں، وہیں اس تفسیر میں مولانا جاراللہؒ کے اپنے خیالات وتعبیرات بھی شامل ہیں۔ اس تفسیر کو مولانا احمد علی لاہوریؒ [64] حجاز سے فوٹو کاپی کرا کے ہمراہ لے آئے۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ [65] نے اسے ترتیب دے کر دو حصوں میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے زیرِ اہتمام شائع کروایا۔ پھر اس کا اُردو [66] میں ترجمہ ہوا۔ یہ تفسیر سورۃ فاتحہ سے سورۃ توبہ تک متعدد بار شائع ہوچکی ہے۔ [67] اس تفسیر کا ایک قلمی نسخہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد میں موجود ہے، جس پر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے تین سکالرز تحقیقی کام میں مصروف ہیں۔

ii۔ القاء المنان فی تفسیر القرآن

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی بیان کردہ یہ تفسیر سندھی زبان میں ہے۔ یہ تفسیر آپؒ کے ایک شاگرد مولانا محمد مدنیؒ [68] نے حجاز میں قیام کے دوران قلم بند کی۔ یہ قرآن پاک کی مکمل تفسیر ہے۔ مولانا محمد مدنیؒ نے اپنے شاگرد مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ کے حوالے کی، جنھوں نے اسے سورۃ یوسف تک تین جلدوں میں شائع کروایا۔ یہ تفسیر ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے ہے۔ مولانا قاسمیؒ، مولانا سندھیؒ سے ہندوستان میں مستفید ہوئے۔ ان کے ساتھ مولانا عزیزاللہ جروارؒ [69] بھی تھے۔ مولانا عزیزاللہ جروارؒ سے سندھی تفسیر کے قلمی نسخے کی فوٹو کاپی مولانا مفتی عبدالقدیر [70] نے حاصل کی۔ اس کا اردو زبان میں ترجمہ حکیم محمد اقبال [71] نے کیا۔ بعد ازیں مولانا غلام مصطفیٰ راجپر [72] نے اس ترجمے کی تصحیح کی۔ تفسیر کا اردو ترجمہ جامعہ اشاعت العلوم چشتیاں کے ماہانہ مجلّہ ''العزیز'' جو مولانا مفتی عبدالقدیر کی ادارت میں شائع ہوتا ہے، میں مرحلہ وار شائع ہو رہا ہے۔ یہ قلمی نسخہ چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔

iii۔ تفسیر المقام المحمود

مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے عصرِ حاضر میں قرآن حکیم سے استفادے کے لیے نہ صرف بنیادی اصولوں کا تعین کیا، بلکہ قرآن حکیم کی آیات کی تفسیر وتشریح کو اصولِ اعتبار کے حوالے سے پیش کیا، جس کو ان کے بعض تلامذہ نے اپنے الفاظ میں محفوظ کرلیا۔

ان میں سے کچھ مواد کو مولانا سندھیؒ نے ملاحظہ کیا، اس تفسیری مواد کو مختلف عنوانات سے مرتب کیا گیا جو درج ذیل ہیں۔

یہ تفسیر اردو میں سات جلدوں پر مشتمل ہے، جو کہ 975 اوراق پر قلمی شکل میں ہے۔ یہ تفسیر ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد میں موجود ہے۔ اس تفسیر کو مولانا عبداللہ بن نہال لغاری [73] نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے براہِ راست مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران سن کر نقل کیا۔ ان میں تین جلدوں کے عنوانات بھی مقرر کیے۔

1۔ **جلد اوّل:** اس کا نام ''**المقام المحمود فی تفسیر کتاب اللّٰہ الودود الملقّب بمواقف المسترشدین**'' ہے۔ یہ 122 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں سورت فاتحہ، سورت البقرہ، سورت آلِ عمران، سورت النساء، سورت المائدہ کی تفسیر ہے۔ یہ مطبوعہ شکل میں دستیاب ہے۔ مطبوعہ تفسیر کی تحقیق، تنقیح، تعلیق مولانا مفتی عبدالقدیر نے کی، جو 655 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سے سورت الفاتحہ اور سورت البقرہ کی ڈاکٹر منیر احمد مغل [74] نے تدوین کی اور سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

2۔ **جلد دوم:** اس کا نام ''**المقام المحمود فی تفسیر کتاب اللّٰہ الودود الملقّب بسبیل الرّشاد**'' ہے۔ یہ 296

www.rahimia.org

اوراق پر مشتمل ہے۔ سورت الانعام تا سورت التوبہ کی تفسیر ہے۔

3۔ **جلد سوم**: یہ 36 اوراق پر مشتمل ہے۔ سورت یونس کی تفسیر ہے۔

4۔ **جلد چہارم**: یہ جلد 155 اوراق پر مشتمل ہے۔ سورت ہود تا سورت طٰہٰ کی تفسیر ہے۔ جلد سوم اور چہارم میں سے کچھ حصہ سورت یونس سے سورت کہف تک مولانا محمد معاویہ نے مرتب کیا، جسے بیت الحکمت شاہ ولی اللہ دہلوی، کبیر والا نے شائع کیا۔

5۔ **جلد پنجم**: یہ جلد 104 اوراق پر مشتمل ہے۔ سورت الانبیاء، تا سورت الشعراء کی تفسیر ہے۔

6۔ **جلد ششم**: اس جلد کا نام ''**المقام المحمود فی تفسیر کتاب اللّٰہ الودود الملقب بالبیّنات**'' ہے۔ یہ 119 اوراق پر مشتمل ہے۔ سورت النمل تا سورت الحجرات کی تفسیر ہے۔

7۔ جلد ہفتم: یہ جلد 143 اوراق پر مشتمل ہے۔ سورت ق سے سورت الناس تک سورتوں کی تفسیر ہے۔ [75]

iv۔ قرآنی شعورِ انقلاب

1940ء میں مولانا سندھیؒ کا ہندوستان سے واپسی پر ایک ہی مقصد تھا کہ حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم و معارف، فلسفہ وحکمت پر قرآنی تعلیمات کا فروغ کیا جائے، تاکہ مسلمان لادین انقلاب سے متأثر ہونے کے بجائے امام شاہ ولی اللہ کے فلسفے پر غلبۂ دین کے لیے جدوجہد کریں۔ مولانا سندھیؒ نے اس مقصد کے لیے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے دو شاگرد مانگے۔ اس پر حضرت لاہوریؒ نے اپنے دو شاگردوں کو حضرت سندھیؒ کے سپرد کیا۔ ان میں سے ایک حضرت مولانا بشیر احمد لدھیانویؒ [76] اور دوسرے مولانا خدابخش بی۔اے تھے۔ 1940ء سے 1944ء تک مسلسل چار سال تک ان دونوں حضرات نے بڑی محنت، جاں فشانی اور خلوص کے ساتھ مولانا سندھیؒ سے ولی اللّٰہی علوم و افکار اور دینی تعلیمات کا جامع انداز و اسلوب سیکھا۔ خاص طور پر حضرت مولانا بشیر احمد لدھیانویؒ نے حضرتؒ کی تقاریر قلم بند کیں اور ''امالی'' کے عنوان سے فل سکیپ کاغذ کے تقریباً ساڑھے تین ہزار صفحات پر مشتمل مولانا سندھیؒ کے افکار قلم بند کیے۔ [77] یہ ''امالی'' ہفت روزہ ''خدام الدین'' لاہور میں شائع ہوتی رہی، جس میں شامل سورتوں کی تفصیل مع عنوانات حسب ذیل ہے:

سورت فاتحہ کی تفسیر (قرانی اساسِ انقلاب)، سورت محمد (قرآنی جنگِ انقلاب)، سورت فتح (قرآنی عنوانِ انقلاب)، سورت المزمل و سورت المدثر (قرانی دستورِ انقلاب)، سورت العصر (قرآنی اصولِ انقلاب)، سورت الاخلاص، سورت الفلق اور سورت الناس (قرآنی فکرِ انقلاب) کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ان کے عنوانات مولانا بشیر احمدؒ نے مقرر کیے۔ سورت المجادلہ (قرآنی حزبِ انقلاب)، سورت الحشر (قرآنی اقدامِ انقلاب)، سورت الممتحنہ (قرآنی قانونِ انقلاب) کی تفسیر ہے۔ ان تین سورتوں کے عنوانات شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن ملتان نے مقرر کیے۔

درجِ بالا سورتوں کے علاوہ باقی سورتوں کا مواد مولانا بشیر احمدؒ کے صاحبزادگان [78] نے مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری کو فراہم کیا، جن میں سورت الصّف (قرآنی صفِ انقلاب)، سورت الجمعہ (قرآنی حکمتِ انقلاب)، سورت المنافقون (قرآنی ضبطِ

انقلاب) اور سورت التغابن (قرآنی جمعِ انقلاب) شامل ہیں۔ ان سورتوں کے عنوانات مفتی آزاد صاحب نے مقرر کیے اور تحقیقی کام کیا۔ اس تفسیری مجموعے کو ''قرآنی شعورِ انقلاب'' کے نام سے شائع کیا۔ (79)

مولانا مفتی عبدالقدیر نے مولانا سندھیؒ کی تفاسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''مولانا سندھیؒ کی تمام تفاسیر امام شاہ ولی اللہ (دہلویؒ) کے اصولِ تفسیر کی روشنی میں ہیں۔ تفسیر **الھام الرّحمٰن** کا طرز فلسفیانہ ہے، جب کہ سندھی تفسیر عمومی مزاج کو سامنے رکھ کر تحریر کی گئی ہے۔ تفسیر ''المقام المحمود'' اور ''قرآنی شعورِ انقلاب'' جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لیے ہے۔'' (80)

ذیل میں تفاسیر کی ابتدائی آیات کو پیش کیا گیا ہے۔ المقام المحمود سے سورت الفاتحہ کی پہلی آیت کی تفسیر ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جو پالنے والا ہے سارے جہان کا)

تفسیر: تمام جہانوں کا رب اللہ تعالیٰ اور وہی ستائش کے قابل ہے۔ کائناتِ عالَم کو پیدا کرنے والی ایک ہستی ہے، جس کے ہاتھ میں نظامِ عالَم کی باگ ہے۔ ریت کے ذرّات سے لے کر اشرف المخلوقات (انسان) تک تمام اس کے تابع ہیں۔ اس کی عدالت عالیہ کی ہے کہ ہر اپیل کا فیصلہ وہاں سے ہوتا ہے۔ (81)

اسی آیت کی تفسیر ''قرآنی شعورِ انقلاب'' میں بہت تفصیل سے موجود ہے، جو کتاب کے 14 صفحات پر پھیل ہوئی ہے۔ اس کے اہم نکات یہاں بیان کیے جاتے ہیں:

اللہ کی تعریف کی اساس کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسانی قوموں میں جو نظام تشکیل دیا، وہ بہترین ہے۔ اس سے بہتر نظام وجود میں آنا ممکن نہیں۔ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اشیا میں اچھائی اور برائی کا معیار کیا ہے؟ اچھی چیز وہ ہے، جو انسان کے نوعی تقاضوں کے موافق ہے اور بُری وہ چیز ہے، جو انسان کے نوعی تقاضوں کی مخالف ہے۔

حمدِ الٰہی کے چار گوشے ربّ العالمین، الرحمٰن، الرحیم اور مالک یوم الدین ہیں۔ ربّ اور عالمین کے لفظی معنی بیان کیے گئے ہیں۔ رب کا معنی کسی شیئے کو تدریجاً نشوونما دے کر تکمیل تک پہنچانے والا۔ عالمین سے یہاں مراد اقوام ہے۔ رب العالمین سے مراد رب الاقوام بھی ہے۔ انسان کی تین بنیادی خصوصیات (رائے کلی، حُبِّ جمال، عقل و درایت) کو بیان کیا گیا ہے۔ انھی خصوصیات کی بنیاد پر انسانی معاشروں میں ارتفاقاتِ معاشی و عقلی (82) پیدا ہوتے ہیں۔ بعد ازیں اللہ تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ (83)

اگر ان دونوں تفسیروں کا جائزہ لیں تو واضح ہوتا ہے کہ جو بات ''المقام المحمود'' میں مختصر پیرائے میں کی گئی ہے، ''قرآنی شعورِ انقلاب'' میں اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

سورت البقرہ کی دوسری آیت کی تفسیر ''الہام الرحمٰن'' میں چار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، جس میں کتاب کے لاریب ہونے اور متقین کی ہدایت سے مراد پر گفتگو کی گئی۔ جملہ معترضہ کے ذیل میں دلائل بھی دیے گئے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

www.rahimia.org

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲

(اس کتاب میں کچھ شک نہیں، راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو)

خلاصۂ تفسیر: قرآن حکیم کی تعلیم نے مکی معاشرے میں یہ تاثیر پیدا کی کہ وہاں ایک اجتماعی حکومت منظّم ہوگئی۔ چناں چہ مسلمان تمام فیصلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے قرآن حکیم کے مطابق ہی کرتے تھے۔ یہ معاملہ تو مسلمانوں کے درمیان تھا۔ غیر مسلموں سے مکی معاشرے کے عام دستور کے مطابق معاملہ کرتے تھے۔ گویا مکہ میں ایسی جماعت پیدا ہوچکی تھی، جو عدل و احسان دنیا میں قائم کرنے پر اپنے پورے عزم اور ارادے کے ساتھ تیار تھی۔ یہ جماعت انسانی فطرت کے خلاف کسی تعلیم کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس کتاب کی تاثیر سے قریش اور دیگر عرب، یہود و نصاریٰ اور مجوس کے صالح افراد پر مشتمل ایک جماعت بن گئی۔ اس جماعت کی نظیر دنیا کی اقوام اور ادیان میں نہیں ملتی۔ اس آیت کے یہی معنی ہیں کہ یہ کتاب ان متقین کو پیدا کرنے والی ہے، جو مکہ میں پیدا ہوئی۔ یہ اس کتاب کے آسمانی کتاب ہونے کی پختہ دلیل ہے۔ پس دعویٰ یہ ہے کہ قرآن حکیم ایک لاریب کتاب ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے۔ (84)

اسی آیت کی تفسیر ''القاء المنان'' کی روشنی میں حسب ذیل ہے:

تفسیر: کتاب اللہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ کتاب اللہ کے نظام کو قائم کرنے والے آدمی پیدا کر دے۔ انصار جب مہاجرین کی طرف دیکھیں گے جو اس کتاب کی تعلیمات سے پیدا ہوئے ہیں تو اس کتاب کے کتاب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں رہے گا۔ (انصار و مہاجرین) اس کتاب کی ہدایت سے پیدا ہونے والے متقین ہیں۔ کسی دایہ کے پاس پرورش پانے والے بہادر نوجوان کو اس کی نسبت سے کہا جاتا ہے کہ یہ اس کے دودھ سے جوان بہادر پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح یہاں اس کتاب کی رہنمائی سے یہ دو جماعتیں (مہاجرین و انصار) پیدا ہوئی ہیں تو اس سے اس کتاب کا کتاب اللہ ہونا بلا ریب ثابت ہو جائے گا۔ (85)

ان دونوں تفسیروں کو پیش نظر رکھیں تو ''الہام الرحمٰن'' کی تفسیر میں جملہ معترضہ کی صورت ایسی معلومات اور حالات و واقعات اور منفرد تبصرے بھی موجود ہیں، جو اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں، گو بسا اوقات ان کا براہِ راست تفسیری آیات سے تعلق نہیں، جب کہ سندھی تفسیر میں عام فہم انداز سے اور ایک سماجی مثال سے بات سمجھا دی۔

نتائجِ بحث

1۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے علومِ قرآنیہ پر تعلیم و تربیت کے لیے 1913ء میں ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' بنائی۔ انھوں نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو بہ طور ناظمِ اعلیٰ تعینات کیا۔

2۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ مطالعۂ قرآن کے لیے قرآنی تعلیمات کی مقصدیت کو پیشِ نظر رکھ کر، روحِ عصر کے تناظر میں مطالعۂ قرآن، قرآنی الفاظ کی معنویت پر تدبر کی دعوت دیتے ہیں۔ قصص القرآن کے اجتماعی مطالعے سے سماج کی تشکیل کے بنیادی امور کی رہنمائی لینے کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

3۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی بیان کردہ قرآن حکیم کی تفاسیر کو چار عنوانات کے تحت علاحدہ علاحدہ مرتب کیا گیا؛ الہام الرحمٰن،

www.rahimia.org

القاء المنان فی تفسیر القرآن، المقام المحمود، قرآنی شعور انقلاب۔ یہ چاروں تفاسیر امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اصولِ تفسیر (الفوز الکبیر فی اصول التفسیر) کی روشنی میں مرتب کی گئی ہیں۔

4۔ ''المقام المحمود'' اور ''قرآنی شعورِ انقلاب'' اُردو زبان میں ہیں اورجدید تعلیم یافتہ سکالرز کے ذوق کی تسکین کرتی ہیں۔ ''الہام الرحمٰن'' عربی زبان میں ہے اورفلسفی مزاج علما کے لیے بہت سے اہم نکات لیے ہوئے ہے۔''القاء المنان'' سندھی زبان میں ہے، جوترتیبِ نزولی کے اعتبار سے ہے، جوعوامی رنگ لیے ہوئے ہے۔

4۔ نظارۃ المعارف کے اصول مطالعہ قرآن اورتفسیری رجحان پرتحقیق سے ایک ایسا موقع میسرآتا ہے، جس سے وابستہ مفسرین قرآن پرعملی زندگی گزارتے ہیں۔آزادی کے لیے جدوجہد میں مشغول ہیں اوراس عمل کے لیے بنیادی فکرقرآن حکیم سے حاصل کرتے ہیں۔مولانا عبیدا للہ سندھیؒ کا علمی وعملی کردارتفسیری میدان میں ایک نئے انداز کو متعارف کرواتا ہے، جو روایتی تفسیری انداز سے الگ ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ خلافتِ عثمانیہ کی بنیادعثمان خان بن ارطغرل (1326-1258ء) نے رکھی۔خلافت کا پھیلاؤ بہ تدریج عمل میں آیا اورخلافتِ عثمانیہ کے معروف حکمران سلطان محمد فاتح (81-1429ء) نے موجودہ ترکی کے شہراستنبول (قسطنطنیہ) کو 1453ء میں فتح کیا اوراسے خلافتِ عثمانیہ کا بین الاقوامی مرکز بنایا۔خلافت کا یہ سلسلہ پہلی جنگِ عظیم (18-1914ء) تک موجود رہا۔پہلی جنگِ عظیم کے بعد زوال پذیر خلافت 1922ء میں خلیفہ کے عہدے سے بھی محروم ہوگئی۔1924ء میں خلافت کی جگہ جمہوریہ ترکی کا اعلان کردیا گیا۔
(محمد عزیز، ڈاکٹر، دولت عثمانیہ، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ہندوستان، 2009ء، ج:1،صفحات:16، 94۔ و میرٹھی، زین العابدین سجاد،مفتی، واکبرآبادی، انتظام اللہ شہابی،مفتی،تاریخ ملت،ادارہ اسلامیات، لاہور، 1991ء۔ج:3،ص:210)

2۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ (62-1703ء) کا نام قطب الدین احمد تھا۔آپؒ نے اسلامی عقائد،عبادات واحکامات کے اسرار بتائے۔قرآنی فکرو فلسفہ،قرآنی حکمت اوراس کے احکامات کی بنیادی روح کو واضح کرنے کے لیے ''حُجّۃُ اللّٰہِ البالِغہ'' تصنیف فرمائی۔قرآنی تعلیمات اور ان کے مقاصد کوسمجھنے کے لیے ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ''تصنیف کی۔قرآنی تعلیم کوعام کرنے کے لیے ''فتح الرّحمٰن بترجمۃ القرآن'' کوتصنیف کیا۔ان اصولوں پرآپؒ کی اولاد میں سے امام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (1824-1746)،حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ (1814-1753) اورشاہ رفیع الدین دہلویؒ (1818-1750) نے قرآنِ حکیم کے تراجم اورتفاسیر لکھیں۔
(سندھی، عبیداللہ، مولانا، شاہ ولی اللہ اوران کا فلسفہ، سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور، 2002ء،ص:28۔ وآزاد،عبدالخالق،مفتی،قرآن حکیم کی تفسیر کا ایک جامع اسلوب اوراس کے ارتقاء کا جائزہ،مجلّہ شعورآگہی، اکتوبر تا دسمبر 2009،شمارہ نمبر4، 3۔1:6۔ وندوی، ابوالحسن علی حسنی،سید،تاریخ دعوت وعزیمت۔مجلس تحقیقات ونشریات اسلام،لکھنو، 2006ء، 5:97)

3۔ ولی للّٰہی فکر کے حاملین میں خانوادۂ شاہ ولی اللہؒ،آپؒ کے جانشین امام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (1824-1746)، امام شاہ اسحاق دہلویؒ (1846-1783)، حاجی امداد اللہ مہاجرمکیؒ (99-1818)،مولانا قاسم نانوتویؒ (1980-1832)،مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (1905-1827)، شاہ عبدا لرحیم رائے پوریؒ (1919-1853)، شیخ الہند مولانا محمودحسنؒ (1920-1851)، مولانا عبید اللہ سندھیؒ (1944-1872) نمایاں ہیں۔

4۔ اساسی اصول: انبیا کی بعثت کا مقصد معاشرے میں عدل و انصاف قائم کرنا ہے۔ (الحدید۔ 25: 57) قرآن معاشرے میں اپنے نظام کا غلبہ چاہتا ہے۔ (سورت الفتح، 28:48) قرآن معاشرے میں عدل کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ (النحل۔ 90: 16)۔ حضور اکرمؐ اور آپؐ کی جماعت صحابہ نے قرآنی اصولوں کو معاشرہ میں غالب کیا اور عدل کا نظام قائم کیا، جو تقریباً ایک ہزار سال تک غالب رہا۔ برصغیر میں مسلم دور حکمرانی کے زوال کے بعد دینِ اسلام کے سیاسی اور معاشی غلبے کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ عقائد و عبادات اور اس کے اَخلاقی تصورات کو کُل دین سمجھ لیا گیا۔ اس لیے ضرورت تھی کے دین کے حقیقی تصور کو معاشرے میں پیش کیا جائے، تاکہ دینی اقدار کا معاشرے میں غلبہ ہو سکے۔ ان قرآنی تعلیمات کا شعور بیدار کرنے کے لیے نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم کی گئی۔

5۔ سندھی، عبید اللہ، مولانا، **التّمهيد لتعريف أئمّة التجديد**. حیدر آباد (ت، ن)۔ 26

6۔ قومی حالات سے مراد انگریز کے خلاف جدو جہدِ آزادی، بین الاقوامی حالات سے مراد بلقان کی ریاستوں پر یورپی حملے اور خلافت عثمانیہ کا تحفظ۔

7۔ آزاد، عبدالخالق، قرآن حکیم کی تفسیر کا ایک جامع اسلوب، شمارہ نمبر 4۔ 3۔ 45:1

8۔ مولانا محمود حسنؒ (1851-1920ء) کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبند کے تھے۔ ابتدائی علوم کے حصول کے بعد آپؒ کے والد ماجد نے آپؒ کو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (1832–1880) کے سپرد کر دیا۔ آپؒ دارالعلوم دیوبند کے پہلے شاگرد تھے۔ 1873ء میں تدریس کے فرائض سنبھالے۔ ایک عالم دین ہونے کے ساتھ آپؒ کی پوری زندگی برصغیر کی آزادی کے لیے سیاسی و سماجی جدوجہد سے بھی معمور ہے۔ آپؒ نے برطانوی استعمار کے خلاف تحریک چلائی، جو تحریک ریشمی رومال کے نام سے معروف ہے۔ اسی جدو جہد آزادی کی وجہ سے انگریز نے آپؒ کو 1917ء تا 1920ء مالٹا کی جیل میں قید رکھا۔ مالٹا سے رہائی پر آپؒ نے تحریکِ خلافت میں بھرپور حصہ لیا۔ اسی موقع پر مفتیٔ اَعظم مولانا کفایت اللہ دہلویؒ نے آپؒ کے لیے شیخ الہند (Great Leader of India) کے لقب کا اعلان کیا۔ یہ ایک عوامی اجتماع میں عوام کی جانب سے دیا گیا لقب تھا، جو اتنا زبان زدِ عام ہوا کہ آپؒ کے نام کا حصہ بن گیا۔ آپؒ کے شاگردوں میں ہندوستان کی چوٹی کے لیڈر اور علما شامل ہیں۔ (اصغر حسین، سیّد محمد میاں، حیات شیخ الہند۔ وفاق پریس، لاہور، 1977ء۔ ص 20–17، 189۔ و میاں، سید محمد، حضرت مولانا، علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز، لاہور، 2010ء۔ ص 121)

9۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ (1753–1814ء): آپ شاہ ولی للہ دہلویؒ کے تیسرے بیٹے ہیں۔ آپؒ نے اپنے والد صاحبؒ کے ترجمہ قرآن کے اسلوب کو بنیاد بناتے ہوئے قرآن کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ لغت اور الفاظ کے چناؤ میں بہت سی خصوصیات سموئے ہوئے ہے۔ (تاریخ دعوت و عزیمت۔ ج 5، ص 387–386)

10۔ یہ ترجمہ ''موضح القرآن'' ہے، جس میں شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے تفسیری فوائد بھی ہیں۔ یہ ترجمہ آپؒ نے جامع مسجد اکبر آبادی دہلی میں معتکف ہو کر چالیس سال میں مکمل کیا۔ (قاسمی، اَخلاق حسین، دہلوی، مولانا، محاسن موضح قرآن، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، (ت ن)۔ ص 90–89)

11۔ قرآنی علوم کی معرفت کا ادارہ (Institute of Quranic Sciences)۔

12۔ آزاد، عبدالخالق، مفتی، قرآن حکیم کی تفسیر کا ایک جامع اسلوب۔ 45:1

13۔ سندھی، عبید اللہ، مولانا، ذاتی ڈائری۔ مکی دارلکتب، لاہور، 1995ء۔ 18

شاہ جہان پوری، ابوسلمان، ڈاکٹر، امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی۔ حیات و خدمات۔ دارالکتاب، لاہور، 2007ء۔ 248

14۔ منصور پوری، محمد سلمان، ایشیا کا عظیم انقلابی لیڈر۔ حاجی حنیف اینڈ سنز، لاہور، 2001ء، 9-8۔

آزاد، عبدالخالق، درائے پوری، مولانا مفتی، سرگزشت حیات امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی۔ رحیمیہ مطبوعات، لاہور، 2014ء۔ 84

www.rahimia.org

15۔ حضرت حافظ محمد صدیق (م۔ 1891) نے بھرچونڈی شریف (تحصیل ڈھرکی، ضلع گھوٹکی سندھ) خانقاہ کی بنیاد رکھی۔ قادریہ، راشدیہ سلسلے کے بزرگ تھے۔ جدوجہدِ آزادی میں کردار ادا کیا۔ آپ کو ''سید العارفین'' کا لقب دیا گیا۔ حامی عبیدی دین پوری، یدِ بیضا۔ انجمن خدام الدین، لاہور۔ 59-39

16۔ آزاد، عبدالخالق، سرگزشت حیات۔ 55-50

17۔ شیخ ابوالحسن مولانا سید تاج محمود امروٹیؒ (1929-1859) کی ولادت گوٹھ دیوانی ضلع خیر پور میرس سندھ میں ہوئی۔ آپ سید العارفین حافظ محمد صدیق بھرچونڈی شریف کے خلیفہ تھے۔ امروٹ شریف (گڑھی یاسین) میں خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ انگریزوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں شریک عمل رہے۔ (حامی عبیدی، ید بیضا۔ 71)

18۔ آزاد، عبدالخالق، مفتی، قرآن حکیم کی تفسیر کا ایک جامع اسلوب۔ 1:35-28

19۔ مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ:

''شیخ الہندؒ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ نظارۃ کی سرپرستی میں شیخ الہندؒ کے ساتھ حکیم اجمل خان اور نواب وقارالملک ایک ہی طرح کے شریک تھے۔ شیخ الہندؒ نے جس طرح چار سال دیوبند میں رہ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا، اسی طرح دہلی بھیج کر مجھے (عصری علوم سے واقف) نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے شیخ الہندؒ دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاریؒ سے میرا تعارف کرایا اور ڈاکٹر انصاری نے مجھے (محی الدین المعروف) مولانا ابوالکلام آزادؒ (1958-1888) اور مولانا محمد علی جوہرؒ (1931-1878) سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی قیادت سے واقف رہا۔

ابوسلمان، امامِ انقلاب۔ 77۔ و سندھیؒ، عبیداللہ، ذاتی ڈائری۔ 26-27

20۔ مولانا عبدالرحیم رائے پوری (1919-1853) ضلع انبالہ (ریاست ہریانہ انڈیا) کے موضع تگری میں پیدا ہوئے۔ آپؒ قادریہ، مجددیہ سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت میاں عبدالرحیم سہارن پوری، چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ کے بزرگ حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ اجل اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفہ اجل اور جانشین ہیں۔ آپؒ نے رائے پور (ضلع سہارن پور، اُتر پردیش انڈیا) کے ایک باغ میں مستقل قیام فرمایا، جو ''گلزارِ رحیمی'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس خانقاہ نے ''خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور'' کے نام سے شہرت پائی۔ آپؒ نے ہندوستان کی آزادی میں بنیادی اور مرکزی کردار ادا کیا اور ریشمی رومال جیسی بڑی بڑی تحریکات آزادی کی قیادت فرمائی۔

آزاد، عبدالخالق، مفتی، مشائخ رائے پور، دار التحقیق والاشاعت لاہور، 2006ء۔ ص 43

21۔ مولانا خلیل احمد سہارن پوری (1926 - 1852) قصبہ انبیٹھ (ضلع سہارن پور، ریاست اُتر پردیش، انڈیا) سے تعلق تھا۔ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارن پور سے دینی تعلیم حاصل کی۔ مظاہر العلوم میں ہی استاذ مقرر ہوئے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے۔ مولانا محمود حسنؒ کے ساتھ تحریکِ ریشمی رومال میں شریک رہے اور قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہیں۔

اکبر شاہ، مولانا محمد، بخاری، اکابر علمائے دیوبند۔ ادارہ اسلامیات، لاہور، 1999ء۔ 45

22۔ نواب وقارالملک کا نام مولوی مشتاق حسین (1917-1841) ہے۔ آپ امروہا (اتر پردیش انڈیا) کے رہنے والے تھے۔ 1861ء میں آپ کا تعلق علی گڑھ تحریک کے بانی سر سیّد احمد خان (1891-1817) سے ہوا۔ 1866ء میں علی گڑھ تحریک سے وابستہ ہوئے۔ 1875ء میں انڈیا کی ریاست حیدر آباد میں برٹش گورنمنٹ کی ملازمت اختیار کی اور 17 سال تک وابستہ رہے۔ آپ کی شاندار خدمات کی بنیاد پر آپ کو نواب وقارالملک کا خطاب ملا۔ 1907 سے 1914 تک علی گڑھ کالج بورڈ کے سیکرٹری کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اسی دوران آپ کا تعلق شیخ الہند سے ہوا۔

www.rahimia.org

http://aligarhmovement.com/karwaan_e_aligarh/Nawab_Viqarul_Mulk/Muslim_nationalist_movement (01-09-2016)

23۔ حکیم اجمل خان (1927 – 1851) طب کی دنیا میں نمایاں نام ہے۔ ماہر طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ عالم، دانش ور اور قومی رہنما تھے۔ 1904ء میں مشرقِ وسطیٰ، 1911ء میں یورپ کے سفر پر گئے۔ جہاں طریق علاج پر تحقیقی مطالعہ کیا۔ علاج سے متعلق کئی کتابیں لکھیں۔ تحریک آزادی انڈیا میں سرگرم کردار ادا کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ میں بھی رہے۔ تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ 1921ء میں آل انڈیا کانگریس کے صدر رہے۔ اہلِ وطن کی مشترکہ سیاسی جدوجہد کے حامی تھے۔ آزادی کی جدوجہد میں نمایاں کردار پر عوام نے مسیح الملک کا خطاب دیا۔

http://inc.in/PastPartyPresidents.aspx (01-09-2016)

24۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری (1936–1880) نے اعلیٰ ثانوی درجہ کی تعلیم انڈیا میں حاصل کی۔ 1901ء میں میڈیکل کی تعلیم کے لیے ایڈنبرگ یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہیں ہاؤس سرجن رہے۔ لندن کے مختلف ہسپتالوں میں معاون ڈاکٹر رہے۔ 1913-20ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر رہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے بانیان میں شمار ہوتا ہے۔ تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کے فعال لیڈر رہے۔ 1927ء میں مدراس میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے صدر رہے۔

http://inc.in/PastPartyPresidents.aspx (10-10-2016)

25۔ فتح پوری مسجد 1650ء میں قائم ہوئی۔ مغل بادشاہ شاہ جہاں کی بیوی ممتاز محل کا تعلق فتح پور شہر سے تھا۔ فتح پور اُتر پردیش کے ضلع آگرا میں ایک میونسپل سٹی ہے۔ اسی کی مناسبت سے وہ بیگم فتح پوری کہلاتی تھی۔ بیگم فتح پوری نے اس مسجد کو بنوایا تھا۔ اسی ممتاز محل کے نام سے تاج محل موسوم ہے۔ یہ مسجد دہلی کے مشہور چاندنی چوک کے مغربی طرف پرانی گلی میں واقع ہے۔

R. Nath, History of Mughal Architecture,vol:4, abhinav publications-1:508

26۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ، گزٹ۔ 25 جون 1913ء، شمارہ نمبر 24۔ 5:13

27۔ ''حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه'' امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے، جس میں آپؒ نے قرآنی فکر و فلسفہ، قرآنی حکمت اور اس کے احکامات کی بنیادی روح کو واضح کیا۔ فلسفہ دین و سیاست، ارتفاقات و اقترابات، اسلامی عقائد، عبادات و احکامات کے اسرار بتائے۔ آپؒ نے یہ معرکۃ الآرا کتاب 1734ء میں تصنیف فرمائی۔
آزاد، عبدالخالق، مفتی، قرآن حکیم کی تفسیر کا ایک جامع اسلوب۔ 6:1

28۔ مؤطا امام، امام مالک ابوعبداللہ مالک بن انس بن ابی عامر الاصبحی الحمیری (197 – 93ھ) کی شہرۂ آفاق مجموعہ احادیث ہے۔ ''الموطا'' حدیث کے متداول اور معروف مجموعوں میں سب سے قدیم ترین مجموعہ ہونے کے سبب ام الصحاح کہلاتا ہے۔
نعمانی، عبدالرشید، مولانا، تاریخ تدوین حدیث، سید احمد شہید اکیڈمی، دار عرفات، رائے بریلی، انڈیا، 2002ء۔ 109

29۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''المسوی'' کے نام سے مؤطا امام مالک کی عربی شرح لکھی اور ''المصفی'' کے نام سے فارسی شرح لکھی۔
جلبانی، غلام حسین، مولانا، شاہ ولی اللہ کی تعلیم، ادارہ مطبوعات، لاہور، 1999ء۔ 70

30۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری (70–810) کا مرتب کردہ مجموعہ احادیث جس کا مختصر نام ''الجامع الصحیح'' اور مکمل نام ''الجامع المسند الصحيح المختصر من امور رسول الله صلّى الله عليه وسلّم وسننه و أيامه'' ہے۔ نعمانی، تدوین حدیث۔ 192

31۔ امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری بن دردین (61–202) کا مرتب کردہ مجموعہ احادیث ہے۔ اس کا مختصر نام ''صحیح مسلم'' اور مکمل نام ''المسند الصحيح المختصر بنقل العدل عن العدل إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم'' ہے۔

نعمانی، تدوین حدیث۔ 199

32۔ امام ابوعیسیٰ محمد بن سورہ بن شداد (79–209ھ) کا مرتب کردہ مجموعہ احادیث ہے۔ جامع الترمذی یا سُنَن الترمذی ہے۔نعمانی، تدوین حدیث۔ 222

33۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ، گزٹ۔ 25جون1913ء، شمارہ نمبر 24۔ 5:13

34۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا ایم فل مقالہ بعنوان نظارۃ المعارف القرآنیہ کے تفسیری رجحانات کا عصری تناظر میں تجزیاتی مطالعہ، سیشن12–2010، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

35۔ 1914 میں آل انڈیا نیشنل ایجوکیشنل کانفرنس، راولپنڈی میں منعقد ہوئی۔جس میں مولانا سندھیؒ نے خطبہ صدارت پڑھا۔خطبہ کا موضوع فہم القرآن تھا۔جس میں آپؒ نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو مطالعہ قرآن کے بنیادی امور کی طرف متوجہ کیا۔ یہی خطبہ صدارت ''قرآن کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟'' کےعنوان سے شائع ہوا۔

شاکر، امجد علی، پیش لفظ، قرآن پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟ مکی دارالکتب، لاہور، 2002ء۔ 17

36۔ سندھیؒ، عبیداللہ، مولانا، قرآن پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟ مکی دارالکتب، لاہور، 2002ء۔ 23

37۔ القرآن، سورت المزمل۔ 73:4

38۔ سندھیؒ، عبیداللہ، مولانا، قرآنی شعور انقلاب۔ رحیمیہ مطبوعات، لاہور، 2009ء۔ 592

39۔ سندھیؒ، عبیداللہ، قرآن پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟ 13

40۔ سندھیؒ، عبیداللہ، قرآنی شعور انقلاب۔ 701–699

41۔ سندھیؒ، عبیداللہ، قرآن کریم کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟ 77

42۔ القرآن 25:57۔

43۔ سندھیؒ، عبیداللہ، قرآن پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟۔ 77

44۔ ایضاً۔ 9–8

45۔ ایضاً۔ 5

46۔ القرآن، سورت یوسف۔ 101:12

47۔ سندھیؒ، عبیداللہ، قرآن پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟۔ 56

48۔ ایضاً۔ 66

49۔ ایضاً۔ 40

50۔ نواب محسن الملک کا نام سیّد مہدی علی (1907–1837) ہے۔آپ علیگڑھ تحریک کے سرگرم اراکین میں سے تھے۔ 1899ء سے 1907ء تک ایم اے او کالج علی گڑھ بورڈ کے سیکرٹری رہے۔

http://aligarhmovement.com/karwaan_e_aligarh/Nawab_Mohsinul_Mulk 10-10-2016

51۔ سندھیؒ، عبیداللہ، قرآن پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟۔ 36

52۔ القرآن، سورت الفاتحہ۔ 5:1

53۔ سندھیؒ، عبیداللہ، قرآنی شعور انقلاب۔ 139

54۔ برصغیر کی آزادی کے جذبہ کے تحت لاہور کالج کے کچھ نوجوان افغانستان ہجرت کر گئے۔ کابل میں ان نوجوانوں کا تعلق مولانا سندھیؒ سے

www.rahimia.org

قائم ہوگیا۔ ان میں ظفر حسن ایبک بھی شامل تھے۔ مولانا سندھیؒ نے ان نوجوانوں کی تربیت کے لیے دروسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ ظفر حسن ایبک حکومتِ مؤقتہ ہند میں مولانا سندھیؒ کے سیکرٹری رہے۔ افغان آرمی میں اعزازی کرنل کے طور پر کردار ادا کیا۔ تھرڈ اینگلو افغان وار میں نمایاں کردار ادا کیا۔ روس اور ترکی میں مولانا سندھیؒ کے ساتھ شریک کار رہے۔ بعد ازیں ترکی فوج میں شامل ہوگئے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ایبک، ظفر حسن، خاطرات (آپ بیتی)۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1990ء

55۔ آزاد، عبدالخالق، قرآن حکیم کی تفسیر کا ایک جامع اسلوب شمارہ نمبر 4۔3۔1: 52

56۔ لغاری، عبداللہ، مولانا، مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل۔ دارالکتاب، لاہور، 1988ء۔ 57-54

57۔ اشتراکی فلسفے کا بانی کارل مارکس (83-1818) تھا۔ جس نے سرمایہ کی بنیاد پر معاشی فکر کا انکار کیا اور انسانی محنت کو معیشت کی بنیاد قرار دیا۔ اشتراکی فلسفہ معاشرے کے محنت کش طبقات کو ریاست کا مالک و مختار قرار دیتا ہے۔ تمام آبادی کے سیاسی، معاشی، بنیادی حقوق (خوراک، لباس، رہائش، تعلیم، صحت، انصاف) فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اگر ریاست ایسا نہیں کرتی تو اسے حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اشتراکی (Socialism) فلسفے پر 1917ء میں سوویت رشیا میں انقلاب آیا۔ بعد ازیں دنیا کے دیگر ممالک بھی اس سے متأثر ہوئے، جن میں چین، شمالی کوریا، کیوبا اور وینزویلا نمایاں ہیں۔

Archie Brown, The Rise and Fall of Communism, HarperCollins Publishers (Australia) Pty. Ltd, 2009

58۔ ایبک، ظفر حسن، خاطرات (آپ بیتی)۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1990ء۔ 263-257

59۔ 1922ء سے 1924ء تک مصطفیٰ کمال اتاترک (1938-1881) نے ترک قوم کو قومیت کی اساس پر اکٹھا کیا۔ ان میں ترکی حمیت کو ابھار کر یورپین استعماری قوتوں کو شکست دے کر ترکی حدود سے بے دخل کیا۔ خلافتِ عثمانیہ کی صورت میں مسلمانوں کا بین الاقوامی نظام، جس کا مرکز استنبول (قسطنطنیہ) تھا، کو ختم کر دیا۔ انقرہ کو ترکی کا دارالخلافہ بنایا۔ نیشنلزم کی اساس پر جدید ترکی کی بنیاد رکھی۔
محمد فواد، اتاترک، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ، پنجاب، لاہور، 1964ء۔ ج: 1، ص: 986-961

60۔ آصف، شیخ محمد، ایڈووکیٹ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی انقلابی جدوجہد۔ طیب پرنٹنگ پریس، لاہور۔ 44-43

61۔ ایبک، ظفر حسن، خاطرات۔ 314

62۔ مولانا سندھیؒ نے مشرقی یورپ میں اُبھرتے تمدن کا بہت ہی قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ پھر افغانستان، ترکی اور حجاز میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کا براہِ راست تجزیہ کیا تو آپؒ نے اس دور کے قومی تقاضوں کو سمجھا۔ اس دور میں قومی ریاست کا تصور اُبھرا۔ آپؒ نے اس پر غور کیا کہ قومی ریاستوں کا یہ دور اسلام کی روح کے خلاف نہیں۔ اب اسلام کی عالمگیریت کی اساس قومی ریاستیں بنیں گی۔ دوسرا یہ کہ اسلام کا سیاسی، معاشی و سماجی نظام کیمونزم سے کہیں زیادہ انسان دوست اور غریب پرور ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے میں اس جدید دور کے لیے مکمل رہنمائی موجود ہے۔
محمد سرور، پروفیسر، افادات و ملفوظات، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی۔ ایچ وائی پرنٹرز، لاہور، 1967ء۔ 144

63۔ موسیٰ بیکیف جن کا عربی نام موسیٰ اُفندی جاراللہ الروسی ہے۔ آپ کیکینو (پینز و گورنریٹ، رشیا) میں 1873ء میں پیدا ہوئے۔ آپؒ نے اعلیٰ تعلیم الازہر یونیورسٹی قاہرہ سے حاصل کی۔ روس میں ترقی پسند عالم اور مسلمانوں کے نمائندہ سمجھے جاتے تھے۔ آپؒ نے قرآن حکیم کا تاتاری زبان میں ترجمہ کیا۔ موسیٰ جاراللہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے بہت متأثر ہوئے۔ 1949ء کو قاہرہ مصر میں انتقال کر گئے۔
سندھی، عبیداللہ، مولانا، پیش لفظ (الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن)۔ مکتبہ اوراق، لاہور، 2005ء۔ 6-26

64۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ (1962-1887) بروز جمعہ بمقام قصبہ جلال متصل گکھڑ اسٹیشن ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے نومسلم والد شیخ حبیب اللہ (جن کا خاندان سکھ تھا) نے اپنے دس سال کے بیٹے کو مولانا سندھیؒ کی تربیت میں دے دیا۔ اس کے بعد آپ مستقل

حضرت سندھیؒ کی صحبت میں رہے۔ نظارۃ المعارف میں آپ مولانا سندھیؒ کے معاون تھے۔ شیرانوالہ مسجد لاہور میں عرصۂ دراز تک تفسیر قرآن کی خدمت انجام دی۔ آپؒ کا ترجمہ قرآن مختصر حواشی کے ساتھ معروف ہے۔

لال دین خان، اخگر، ڈاکٹر، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ (سوانح)، مکتبہ خدام الدین، لاہور، 1985ء۔ 32 تا 37

حاکم علی، مولانا لاہوری کے حیرت انگیز واقعات، بیت العلم، کراچی، 1996ء۔ 33

65۔ غلام مصطفیٰ قاسمیؒ (1924-2003ء) ولد الحاج حافظ محمود چانڈیو کی کنیت ابوسعید ہے۔ آپؒ گاؤں بھنبھو خان چانڈیو تحصیل میروخان، ضلع لاڑکانہ میں پیدا ہوئے۔ 1963ء میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سندھ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی اور سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد کے چیئرمین بھی رہے۔ سندھ مسلم کالج کراچی اور سندھ یونیورسٹی میں بھی تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اکیڈمی کے مجلّات الرحیم (اردو و سندھی)، الولی (اردو)، السمکا (انگریزی) کے مدیر رہے۔ امام شاہ ولی اللہ کے سلسلہ فکر کی بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

سندھی، عابد، مولانا، آفتابِ علماء جو غروب ہوگیا، عزم سیریز نمبر 213، 212، ادارہ عزم ملتان، مئی، جون، جولائی 2004ء۔ 63-52

66۔ الہام الرحمٰن کا اردو ترجمہ سورت بقرہ تا سورت مائدہ، فاضل دارالعلوم دیوبند مولانا عبدالرزاق جو کہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے فیض یافتہ تھے، نے کیا۔ اس تفسیر کے مقدمہ، سورت فاتحہ اور سورت انعام تا سورت التوبہ تک اردو ترجمہ مولانا محمد قاسم نے کیا۔ اس کی اشاعت مولانا محمد معاویہ مرحوم نے بیت الحکمت امام ولی اللہ دہلویؒ کے زیر اہتمام کروائی۔ بعد ازیں اس کا عکسی ایڈیشن مکتبہ اوراق لاہور سے 2005ء میں شائع ہوا۔

67۔ سندھیؒ، عبید اللہ، مولانا، نگاہ اولین (الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن)۔ مکتبہ اوراق، لاہور، 2005ء۔ 4-3

68۔ مولانا مدنی صاحبؒ 1907ء میں بالا کے نزدیک گوٹھ بمرا میں پیدا ہوئے۔ 13 سال کی عمر میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ وہی تعلیم حاصل کی۔ مکۃ المکرّمہ حرم میں تدریسی فرائض سرانجام دیے۔ حرم میں ہی مولانا عبیداللہ سندھی سے ملاقات ہوئی۔ مولانا سندھیؒ کے کہنے پر سندھ واپس تشریف لے آئے۔ یہاں سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی میں استاد مقرر ہوئے۔

قاسمی، غلام مصطفیٰ، مولانا، مضمون: مولانا مدنی صاحب کا ترجمہ، ماہنامہ الولی، حیدرآباد، شمارہ نمبر 3، دسمبر 1992ء۔ ج: 16 ص: 10

69۔ مولانا عزیز اللہ جروار ولد فقیر خان محمد مری بلوچ (1910-2004ء) گوٹھ گل محمد جروار، بھرگڑی اسٹیشن، تحصیل شہداد کوٹ ضلع لاڑکانہ میں پیدا ہوئے۔ آپؒ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ کے شاگرد تھے۔ مولانا سندھیؒ کی آخری عمر تک خدمت کی۔ مولانا سندھیؒ کی نسبت سے مولانا مفتی عبدالقدیر کے ساتھ گہرا تعلق قائم ہوا۔ مولانا سندھیؒ کی سندھی تفسیر بھی آپؒ ہی نے مولانا مفتی عبدالقدیر صاحب کو عنایت کی تھی۔

سندھی، عابد، مولانا، آہ! مولانا عزیز اللہ جروار بھی گئے!، عزم سیریز نمبر 215، ادارہ عزم ملتان، اکتوبر، نومبر، دسمبر 2004ء۔

70۔ مولانا مفتی عبدالقدیر 26/ اپریل 1960ء کو پیدا ہوئے۔ آپ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے فاضل ہیں۔ آپ خانقاہِ رائے پور کے مسند نشین رابع حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کے خلیفہ مجاز ہیں۔ آپ جامعہ اشاعۃ العلوم چشتیاں ضلع بہاولنگر کے مہتمم ہیں۔ آپ ماہنامہ ''العزیز'' کے ایڈیٹر ہیں۔

71۔ حکیم محمد اقبال سندھ کے ایک مدرسہ میں سکول ٹیچر تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد چشتیاں ضلع بہاولنگر کے گاؤں 129 مراد (چھوٹی) میں آگئے اور اس وقت کاشت کاری کر رہے ہیں۔ آپ سندھی زبان میں مہارت رکھتے ہیں۔

72۔ مولانا غلام مصطفیٰ راجپر دارالعلوم کھڈہ کراچی میں استاذ ہیں اور بطور لائبریرین خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

73۔ عبداللہ بن نہال خاں بن محمد خان بن رستم خاں بن فتح محمد خاں لغاری (1871-1958ء) میں میرپور ماتھیلا (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے امروٹ (ضلع سکھر) میں ملاقات ہوئی۔ ان کی تحریک میں شامل ہوگئے۔ ہدایت الاخوان کے نام سے ایک

رسالہ جاری کیا۔ مولانا سندھیؒ کے سفر افغانستان سفر حجاز میں ان کے ساتھ رہے۔ مولانا سندھیؒ کی بیشتر تصنیفات آپ ہی کے جمع کردہ ہیں۔ سندھ یونیورسٹی میں معلم بھی رہے۔

لغاری، عبداللہ، مولانا، مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل۔ 264-262

74۔ جسٹس (ر) ڈاکٹر منیر احمد مغل 7/ جولائی 1939ء کو پیدا ہوئے۔ ایم اے اور ایل ایل بی کے بعد 1980ء میں پی ایچ ڈی سندھ یونیورسٹی مکمل کی۔ پاکستان کی مختلف عدالتوں میں جج اور مشیر رہے۔ نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کے قانونی مشیر ہیں۔

75۔ منیر احمد مغل، ڈاکٹر، تنقیح، توضیح، تشریح، تفسیر المقام المحمود۔ مکتبہ رشیدیہ، لاہور۔ 79-78

76۔ مولانا بشیر احمد ولد مولانا اللہ دین (1974-1899ء) لدھیانہ (انڈیا) کے محلّہ اقبال گنج میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ مختلف اخبارات سے وابستہ رہے بعد ازیں انجمن حمایت اسلام کے مدارس میں تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہے۔

سندھیؒ، عبیداللہ، قرآنی شعور انقلاب۔ 84-76

77۔ سندھیؒ، عبیداللہ، قرآنی شعور انقلاب۔ 80

78۔ محترم جناب بلال احمد، محترم جناب ہلال احمد لاہور میں رہائش پذیر تھے اور دونوں بھائی انتقال کر چکے ہیں۔ قبرستان میانی صاحب لاہور میں مدفون ہیں۔

79۔ ایضاً۔ 5

80۔ بالمشافہ ملاقات۔ بمقام جامعہ اشاعت العلوم چشتیاں، 19 جنوری، 2017ء، بروز جمعرات، رات 10 بجے۔

81۔ سندھیؒ، عبیداللہ، المقام المحمود۔ 1:185

82۔ اس کا مادہ ''ر۔ف۔ق'' ہے۔ کسی کے ساتھ نرمی برتنا، رحم کرنا، مہربانی کرنا، ساتھ رہنا، ساتھ دینا۔ اسی سے رفیقۂ حیات ہے یعنی زندگی بھر کا ساتھ دینے والی بیوی۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے عمرانی فلسفے میں اسی لفظ سے ''ارتفاقات'' کی اصطلاح ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ معاشرتی رفاقت یعنی ارتفاقاتِ معاشیہ کے چار درجات پیش کرتے ہیں: ارتفاقِ اوّل (دیہاتی / قبائلی رفاقت)، ارتفاقِ دوم (شہری/تمدنی رفاقت)، ارتفاقِ سوم (قومی رفاقت)، ارتفاقِ چہارم (بین الاقوامی رفاقت)۔ یہ انسان کا مادی ارتقا ہے۔ اسی طرح انسان کی روحانی ترقیات بھی ہیں، جس میں وہ اللہ سے تعلق قائم کرتا ہے اسے ارتفاقاتِ عقلیہ یا اقترابات کہتے ہیں۔ ارتفاقاتِ عقلیہ کے شعوری ادراک کے بغیر ارتفاقات معاشیہ بھی درست بنیادوں پر آگے نہیں بڑھ سکتے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، شاہ ولی اللہ، محدث دہلوی، حجة اللّٰه البالغه، المبحث الثالث، مبحث الارتفاقات، قدیمی کتب خانہ (ت ن)۔ ج:1، ص:89

83۔ سندھیؒ، عبیداللہ، قرآنی شعور انقلاب۔ 106-121

84۔ سندھیؒ، عبیداللہ، امام، الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن، مکی دارالکتب، لاہور، 2005ء۔ 79-82

85۔ سندھیؒ، عبیداللہ، مولانا، قلمی نسخہ، سندھی تفسیر، لائبریری جامعہ اشاعت العلوم، چشتیاں۔

☆

www.rahimia.org

بیادِ شیخ

ہمارے رہبر و رہنما اور مربی

حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ

تحریر: حافظ نورالدین سومرو

سرزمینِ سندھ اس حوالے سے خوش نصیب دھرتی ہے کہ شروع سے یہاں پر ولی اللّٰہی تحریک کا مرکز و اثرات رہے ہیں۔ جب حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی تحریک کے مراکز قائم فرمائے تو سندھ میں ٹھٹھہ شہر میں بھی ایک مرکز قائم ہوا، جو کہ اُس وقت سندھ کے مرکزی شہر کی حیثیت رکھتا تھا، جہاں حضرت مخدوم محمد معین ٹھٹھویؒ، حضرت شاہ صاحبؒ کے فکر و نظریے کے نمائندے تھے۔ اس طرح یہ شہر ابتدا سے ولی اللّٰہی حکمت کا مرکز رہا ہے۔ [1] اور اس مرکز کے ذریعے سندھ میں ولی اللّٰہی فکر و حکمت کی آبیاری ہوتی رہی۔

جب حضرت امام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کے خلاف ''فتویٰ دارالحرب'' جاری فرمایا اور وطنی آزادی کے لیے حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کی سرکردگی میں آزادی کی تحریک کی تشکیل فرمائی تو آزادی و حریت کے ان علم برداروں نے یاغستان (آزاد قبائل) جاتے ہوئے سندھ دھرتی سے گزر فرمایا تو یہاں سندھ کی مشہور خانقاہ ''خانقاہِ راشدیہ'' پیر جو گوٹھ ضلع خیر پور کے گدی نشین حضرت پیر سیّد صبغت اللہ شاہ اوّلؒ (پیر پگارو) کے پاس تقریباً دو ہفتے سے زیادہ قیام فرمایا، جہاں پر قافلے کی مہمان داری بھی ہوئی۔ اس خانقاہ کے مریدین ''حُرّ'' کے لقب سے معروف ہیں۔ اس طرح پیر جو گوٹھ میں قیام کے بعد شکار پور میں بھی تقریباً دو ہفتے سے زیادہ قیام فرمایا تھا۔ اہالیانِ شکار پور نے قافلے کے لیے حسبِ استطاعت ضیافت کا سامان بھی کیا۔ شکار پور کے بعد جیکب آباد (اس وقت خانگڑھ کے نام سے مشہور تھا) سے گزر کر بلوچستان کے شہر بھاگ، ڈھاڈھر، درۂ بولان، شال (موجودہ نام کوئٹہ) کے راستے افغانستان تشریف لے گئے، جہاں سے سفر طے کر کے پشاور کے قریب اپنا مرکز قائم کیا۔

اسی طرح حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ نے تحریکِ آزادی کے حوالے سے ہندوستان بھر میں مراکزِ آزادی قائم فرمائے تو سندھ میں بھی تحریکِ شیخ الہندؒ کے دو مراکز تھے: ایک امروٹ شریف ضلع سکھر میں، جہاں حضرت مولانا سیّد تاج محمود امروٹیؒ [2] اور دوسرا کراچی میں، جہاں پر مولانا محمد صادق کراچویؒ ان مراکز کے رہنما تھے، جہاں سے حریت کی تحریکیں چلائی جاتی تھیں۔ [3] امامِ انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ جب حرمین سے واپس وطن تشریف لائے تو ولی اللّٰہی فکر کی نشر و اشاعت اور ترویج کے حوالے سے دہلی اور لاہور کے علاوہ کراچی، حیدرآباد اور شکار پور وغیرہ کے علاقوں میں ادارے قائم فرما کر اپنی کاوشوں کا آغاز کر دیا۔ [4]

اکابرین کے اس فکر و تحریک کو جدید تنظیمی انداز سے پورے ملک سمیت وادیٔ مہران میں پھیلانے اور اس پر تنظیمی ڈھانچہ

قائم کرنے میں ولی اللّٰہی تحریک کے اکیسویں صدی کے امامِ حکمت و عزیمت، رہبرِ انقلابِ ولی اللّٰہی، داعیٔ تحریکِ نشاۃِ ثانیۂ اسلام، حضرت الامام شاہ سعید احمد رائے پوری قدس سرہٗ السعید اپنی الگ شان رکھتے ہیں۔ 1967ء میں جمعیت طلبائے اسلام کے پلیٹ فارم سے پاکستان میں انقلابی جدوجہد کے لیے ولی اللّٰہی فکر پر کالجز و مدارس کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اور تنظیم شروع کی تو سندھ میں بھی اس صدائے انقلاب کو خوش آمدید کہا گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں نوجوان اس طلبا تنظیم سے وابستہ ہونے کے بعد فخر محسوس کرنے لگے۔ حضرت اقدسؒ پاکستان کے دیگر تمام صوبوں کی طرح سندھ میں بھی دورے فرماتے اور اپنے فکر و شعور کی خوشبو سے نونہالانِ سندھ کے اذہان و قلوب کو معطر فرماتے۔

1987ء میں حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ نے تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی پاکستان کی بنیاد رکھی تو سندھ میں تنظیم کا پہلا پروگرام حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے تحریکی مرکز پیر جھنڈو ضلع حیدرآباد میں منعقد کیا گیا۔ یہ سیمینار مؤرخہ 5/ جون 1987ء بروز جمعۃ المبارک کو منعقد ہوا۔ اس سیمینار کی اس خصوصیت کے علاوہ دوسری خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس پروگرام میں حضرت سندھیؒ کے شاگردِ رشید اور ولی اللّٰہی علوم و افکار پر علمی کام کرنے والی سندھ کی معروف علمی شخصیت حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ بھی باوجود پیرانہ سالی اور ضعف کے شریک رہے۔ انھوں نے خطاب بھی فرمایا اور حضرت اقدسؒ کے کام کی بھرپور تائید و حمایت بھی فرمائی۔ نیز اس حوالے سے اپنی خدمات بھی پیش فرمائیں۔ [5]

حضرت اقدسؒ نے انقلابی فکر پر نوجوانوں کی شعوری آبیاری و تربیت کے لیے پورے پاکستان میں دورے فرمائے۔ اہالیانِ سندھ بھی اس حوالے سے خوش قسمت ہیں کہ شروع سے ہی یہاں پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی توجہات رہیں۔ سال میں تقریباً دو مرتبہ آپؒ کا سندھ کا دورہ ہوتا۔ ہر سال مارچ، اپریل میں شمالی سندھ (سکھر) اور اکتوبر، نومبر میں جنوبی سندھ (کراچی) میں دورہ فرما کر پیاسے قلوب کو اپنے اثر آفریں نظریات و اِرشادات سے سیراب فرماتے۔ اگر ہم عقل و شعور کی تمام تر سچائی اور بغیر اندھی عقیدت کے حقیقت کے ترازو پر پیش کر کے یہ بات کہیں کہ حضرت اقدسؒ نے ہی ہمیں جینے کا مقصد اور زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا تو اس میں ذرہ بھی مبالغہ نہیں۔ دینِ اسلام کی حقیقت و روح اور اس کا شعور و نظریہ ہمیں حضرتؒ نے دیا۔

تعلق باللہ اور انسان دوستی

راقم السطور کو 18/ دسمبر 1992ء کو سکھر کے ہیلتھ ٹیکنیشن سکول میں پہلی مرتبہ حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کے خطاب کی سماعت کا شرف نصیب ہوا۔ اس خطاب کی بازگشت اب بھی سنائی دیتی ہے کہ:

''انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنا نائب و خلیفہ بنایا ہے۔ نائب کا اپنے آقا سے تعلق قائم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ خلیفہ کی حیثیت سے انسانیت کی خدمت ہماری ذمہ داری ہے۔''

حضرتؒ نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ:

''اللہ تعالیٰ کے اَخلاق اگر انسان کے اندر پیدا ہو جائیں تو ہی وہ کامیاب انسان کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ عادل و رازق ہے۔ رحم و محبت کرنے والا ہے۔ انسانوں کی پرورش اور ضروریات مہیا کرنے والا ہے۔ اگر ہم بھی اللہ کی ان صفات و اَخلاق سے متصف ہو جائیں تو یہی درحقیقت تعلق باللہ ہے۔ اس تعلق کے نتیجے میں ہمارے اندر انسانیت

www.rahimia.org

کی محبت و خدمت کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے۔''

دسمبر 1993ء میں کراچی میں ایک تربیتی سیمینار سے خطاب میں حضرتؒ نے نوجوانوں سے ارشاد فرمایا کہ:

''جس نے اللہ کی فرماں برداری کی، وہ مسلمان ہے۔ دل صرف اللہ تعالیٰ کی محبت کی جگہ ہے۔ علم کے حصول کا مقصد تقویٰ پیدا کرنا ہے۔ جب دل میں اللہ آئیں گے تو وہ متقی ہوگا۔ متقی اُسے کہتے ہیں، جو خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ کوئی حکومت، کوئی فرعون، کوئی قیصر و کسریٰ، ابوجہل اپنا خوف اُس پر نہ بٹھا سکے۔''(6)

جولائی 2000ء میں کراچی میں ہی ''سیرت النبیؐ کانفرنس'' سے خطاب کرتے ہوئے حضرتؒ نے ہمیں فرمایا کہ: ''انسانیت کی ترقی یہ ہے کہ انسان کا تعلق باللہ پیدا ہو۔ اللہ سے محبت ہو تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے اَخلاق ہم میں آجائیں گے۔''

سیرتِ انبیائے کرامؑ

حضرت اقدسؒ نے سندھ کے نوجوانوں کو انبیائے کرامؑ کی سیرت کے انقلابی پہلوؤں سے روشناس فرمایا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت یوسف، حضرت لوط، حضرت شعیب، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کے مشن، فکر اور جدوجہد سے بھرپور زندگی کے واقعات کے بیان سے ہمارے عقل و شعور کو منور فرماتے۔ حضرتؒ ہمیں یہی ارشاد فرماتے کہ:

''انبیائے کرامؑ نے اپنے اپنے دور کے ظالم و جابر حکمرانوں کے خلاف مزاحمت کا نظریہ دیا۔ اُن کے ظلم، جبر اور غلامی سے اپنی اپنی قوم کو آزادی دلائی۔ انبیائے کرامؑ نے ملاء اور مترف طبقے کے خلاف نوجوانوں کو نظریہ و شعور دے کر منظّم کیا۔ اسی لیے ہمیں ہر دور کا ظالم حکمران اور مترف طبقہ ہی انبیائے کرامؑ کے خلاف نظر آتا ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے فرماتے کہ:

''ان انبیائے کرامؑ نے نمرود و فرعون سے ٹکر لی اور اپنی قوم کو ان کی غلامی سے نجات دلائی۔''

سیرتِ رسولِ کریم ﷺ

بلاشبہ یہ حضرت اقدسؒ کا ہم نوجوانوں پر احسانِ عظیم ہے کہ آپؒ نے ہم پر پیارے آقا ﷺ فداہٗ اَبی و اُمّی کی سیرت کے حقیقی پہلو واضح فرمائے۔ ہم اپنے نبیؐ کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے کما حقہ واقف نہیں تھے۔ صرف یہی معلوم تھا کہ کفار چوں کہ مشرک تھے، اس لیے وہ حضرت نبی اکرمؐ کی مخالفت کرتے اور تکلیفیں دیتے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ہمارے پیارے نبیؐ نے کُل انسانیت کے لیے کیا کیا تکلیفیں جھیلیں، مصائب کے کتنے پہاڑ عبور فرمائے۔ حضرت اقدسؒ اپنے دورے کے دوران ہر خطاب میں حُبِ رسولؐ کے حوالے سے ارشادات فرماتے۔ حضورؐ کے دور کے سیاسی، معاشی، سماجی اور قومی و بین الاقوامی حالات کی منظرکشی ایسے دل نشیں پیرائے میں بیان فرماتے کہ ذہن میں تمام واقعات یاد ہوجاتے۔ حضرتؒ نے اس دور کا تاریخی شعور ہمارے اندر پیدا کیا کہ پیارے حضورؐ نے اپنے دور کے سماج کو کس طرح تبدیل فرمایا۔ حضورؐ نے جو جدوجہد کی، وہ اصل میں اُس ظالمانہ نظام کے خلاف تھی، جس نے پوری انسانیت کو شرک و کفر، فسق و فجور، ظلم و جبر، غلامی و پستی، معاشی تنگی و بداَخلاقی کی زنجیر میں جکڑ رکھا تھا۔

حضورؐ نے درحقیقت ابوجہل و ابولہب، عتبہ، شیبہ اور اُمیہ بن خلف کے اُس تسلط کے خلاف ایک سماجی انقلابِ عظیم برپا کیا۔ اس کے ساتھ آپؐ نے اس دور کی بین الاقوامی حکمران قوت قیصرِ روم اور کسریٰ ایران کے خلاف اپنی جماعت کو نظریۂ اِنقلاب دیا۔

اپریل 1994ء میں حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کا شمالی سندھ کا ایک خصوصی دورہ ہوا۔ سکھر میں حضرتؒ نے ایک سیمینار میں ہم نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کا مقصد انقلاب برپا کرنا تھا۔ یہ انقلاب انسانیت کو بلند کرنے کے لیے آیا ہے، تاکہ سماجی انصاف، معاشی خوش حالی اور عادلانہ نظام وجود میں آئے۔ آج ہم وہ بلند نظریہ و شعور دے کر اپنی قوم کو ظلم کی چکی سے نکالنا چاہتے ہیں۔'' (7)

پیر جو گوٹھ میں ایک سیمینار میں ہمیں ارشاد فرمایا کہ:

''حضورؐ پر ایمان رکھنے والے پر فرض ہے کہ وہ پوری انسانیت کے لیے رحمت بن جائے اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلائے۔ دراصل یہی دینِ حق ہے۔'' (8)

حضرتؒ حضور اقدسؐ کے دور کے حالات بیان کر کے آج کے حالات سے موازنہ فرماتے اور یہ رہنمائی دیتے کہ:

''اُسوۂ حسنہ کی پیروی میں آج بھی انقلاب کے ذریعے ہی سماجی حالات کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔''

سیرتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین

حضرت اقدسؒ اکثر اپنے خطابات میں سورت المجادلہ کی یہ آیت تلاوت فرماتے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔ ۔ ۔ الآیۃ (9)

اس آیت میں صحابہ کرامؓ کی عظمت و شان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان بیان کرتے کہ: ''صحابہؓ ایسے ہیں کہ رسول اللہؐ کے مقابلے پر اگر ان کے رشتہ دار بھی آتے ہیں تو صحابہ کرامؓ رسول اکرمؐ کو نہیں چھوڑتے اور اپنے رشتہ داروں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کے قلوب میں ایمان راسخ ہو گیا ہے۔ یہی کامیاب لوگ ہیں۔''

حضرتؒ نے اہلِ سندھ کو بتایا کہ: ''صحابہ کرامؓ کی جماعت نے جس طرح قرآنِ حکیم نبی اکرمؐ سے سیکھا، اُسی طرح اس پر عمل کر کے ابوجہل اور قیصر و کسریٰ کے نظاموں کو تبدیل کر کے ہی چھوڑا۔ یہ جماعتِ صحابہؓ کی انقلابیت ہے کہ اُس دور کے سیاسی، معاشی و سماجی افکار و نظریات اور نظاموں کی بیخ کنی کر کے قرآن حکیم کے تمام افکار و نظریات پر ترقی پسند انسانی نظام کو دنیا میں رائج و غالب کر کے دکھایا۔ ان افکار کے مقابلے میں جو سیاسی قوتیں آئیں، وہ نیست و نابود ہو گئیں۔''

حضرتؒ نے ہی ہمیں سمجھایا کہ: ''صحابہ کرامؓ نے جو قربانیاں دیں، وہ قرآن حکیم کے فکر کو غالب کرنے کے حوالے سے تھیں۔ صحابہ کرامؓ نے حضور اکرمؐ کے انقلابی عمل کے ہر حکم کو بلا چوں و چرا تسلیم کیا اور اس پر عمل کیا۔ یہ اُس جماعت کے تنظیمی نظم و ضبط کا مظاہرہ تھا۔''

جماعت صحابہؓ کی برسرِ اقتدار ظالم و جابر قوتوں کے خلاف مزاحمت کا یہ انقلابی طریقۂ کار سمجھانا، حضرت اقدسؒ کا سیرتِ رسولؐ و سیرتِ صحابہؓ کے گہرے مطالعے کے ساتھ انقلاب کی روح اور تکنیک کو سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ حضرت اقدسؒ نے ولی اللّٰہی فکر کی روشنی

www.rahimia.org

میں ہمیں یہ شعور دیا کہ خلافتِ راشدہ کا دور انسانی تاریخ کا ترقی یافتہ دور تھا، جو قیامت تک انسانیت کے لیے مشعلِ راہ بنا رہے گا۔ خلافتِ راشدہ کے دورِ حکومت کی وجہ سے دنیا میں اسلام غالب ہوا۔ قیصر و کسریٰ کے نظام ہائے سیاست و معیشت ختم ہوئے اور دنیا میں عدل و انصاف قائم ہوا۔

دین کی اصل حقیقت اور نظریۂ غلبۂ دین

دین کا مروجہ تصور عبادات، انفرادی اخلاقیات اور چند معاملات تک بتایا جاتا ہے۔ لیکن دین کے حوالے سے حضرت اقدسؒ نے ہمیں بنیادی رہنمائی دی۔ حضرتؒ فرماتے کہ دین اسلام تین بنیادی شعبوں، شریعت، طریقت اور سیاست پر مشتمل ہے۔ ہر حوالے سے انسانیت کی رہنمائی کرتا ہے۔ غلبۂ دین سے مراد اس دین کے نظام عدل کا غلبہ ہے، جس میں انسانوں کے حقوق میسر ہوں، معاشی و سماجی انصاف کے تقاضے پورے ہوں۔

حضرت اقدسؒ سورت الصّف کی آیت هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ ...الآیۃ [10] کی روشنی میں فرماتے کہ: ''دین کا بنیادی مقصد دنیا میں ظلم و زیادتی اور غلامی و معاشی ناہمواری کو ختم کر کے عدل و انصاف اور انسانی آزادی و خوش حالی کا نظام قائم کرنا ہے۔''

نظریۂ توحید کا تقاضا

آج نظریۂ توحید کو محض رسمی عقیدے کے طور پہ بیان کیا جاتا ہے، جب کہ حضرت اقدسؒ کی صحبت و تربیت کے بعد ہم نے سمجھا کہ نظریۂ توحید درحقیقت اللہ تعالیٰ کی غلامی اور انسانیت کی حقیقی آزادی کا اعلان ہے۔ کراچی کے ایک سیمینار میں حضرت اقدسؒ نے نظریۂ توحید کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> ''نظریۂ توحید' آزادی اور وحدتِ انسانیت کا نظریہ ہے۔ انبیاؑ نے ہمیشہ معاشرے میں غریب اور مسکین لوگوں کے اندر فرعونی نظام کے خلاف آزادی کا شعور دیا اور انسانیت کے حقوق کا نظام قائم کرنے کے لیے تکلیفیں اٹھائیں۔'' [11]

اس تناظر میں آپؒ سیرت النبیؐ سے حوالے دیتے اور فرماتے کہ:

> ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد بھی انسانیت کی آزادی کی ہی جدوجہد تھی۔''

آزادی و حریت

ہم ہر سال 14 / اگست کو خوشی خوشی آزادی کا دن مناتے ہیں، لیکن ہمیں پتہ ہی نہیں کہ آزادی ہے کیا اور اس کا تصور اور تقاضے کیا ہوتے ہیں؟ یہ سوچ بھی حضرتؒ نے ہی درست فرمائی۔ سکرنڈ (نواب شاہ) میں ایک سیمینار میں حضرت اقدسؒ نے اہلِ سندھ کو حقیقی آزادی کی پہچان بتائی۔ آپؒ نے فرمایا کہ:

> ''جس قوم کی تقدیر دشمن کے ہاتھوں میں ہو، وہ کیسے ترقی کر سکتی ہے؟ ہماری تعلیم، سیاست اور خارجہ پالیسی تک ان کے اشاروں پر بنتی ہیں۔ جو قوم اور ملک اس حد تک غلام اور محتاج ہو، وہ کیسے آزاد کہلا سکتی ہے؟ اگر ہم یہ

زعمِ خود اپنے آپ کو آزاد سمجھ کر ترقی بھی کریں تو وہ ترقی کس کو فائدہ پہنچائے گی؟ غلام کی محنت اس کا مالک ہی حاصل کرے گا۔'' (12)

دینی سیاست کا فہم و شعور

حضرت اقدسؒ نے دینی سیاست اور مروّجہ سیاست کے حوالے سے ہمارے اندر گہرا شعور و نظریہ پیدا فرما کر فرق بتایا۔ اکتوبر 2001ء میں کراچی میں ایک زونل سیمینار میں ہمیں فرمایا کہ: ''متقی لوگوں کی سیاست سے دنیا میں نیکی غالب آتی ہے، حقوق قائم ہوتے ہیں اور عدل کا نظام قائم ہوتا ہے، لیکن مفسد لوگوں کی سیاست سے معاشرہ جہنم بن جاتا ہے۔ اَخلاقِ رذیلہ پیدا ہوتے ہیں۔ خواہشات غالب آتی ہیں۔ عدالت ختم ہو جاتی ہے اور شیطان صفت لوگوں کے غلبے کی وجہ سے عقل و شعور ختم ہو جاتا ہے۔''

مسجد کا اصل نظریہ

اپریل 1994ء میں حضرت اقدسؒ کا شمالی سندھ کا خصوصی دورہ ہوا۔ اس سلسلے میں شکارپور میں بھی حضرت اقدسؒ کی تشریف آوری ہوئی۔ محلے کی جامع مدنی میمن مسجد میں نوجوانوں اور متعلقین کی کثیر تعداد سے خطاب کرتے ہوئے حضرتؒ نے مسجد کے حوالے سے ہمارے شعور کے دریچے یوں وا کیے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ:

''نماز کی روح یہ ہے کہ نمازی ہر قسم کے منکرات کو مٹانے والا اور معروف کو قائم کرنے والا بن جائے۔ لیکن آج مساجد (نظامِ ظلم کی وجہ سے) شکست کھا چکی ہیں۔ کیوں کہ ان کی اجتماعیت اور سیاست نہ رہی۔ خانقاہیں اور مساجد بہادر ہوں گی تو اَخلاق کا غلبہ ہوگا۔ جب تک مسجد کا نظریہ مسجدِ نبویؐ جیسا نہ ہوگا، کامیابی نہیں ہوگی۔'' (13)

غرض یہ کہ ہماری محدود و اِنفرادی سوچ اور سطحی تصورات کو حضرتؒ نے وسعت دی اور اجتماعیت کے نظریے سے بدل دیا۔ دسمبر 2006ء میں سندھ کے دورے پر رونق افروز ہوئے تو شمالی سندھ کے اہم شہر محراب پور میں نوجوانوں کے ایک سیمینار میں اسی حوالے سے ہمیں پھر سمجھایا کہ:

''ہماری بعض مساجد فرقہ پرستی کا درس دیتی ہیں، حال آں کہ مسجدِ نبویؐ اجتماعیت کا درس دیتی تھی اور وہاں بیٹھ کر خلفا حکومت کا نظم و نسق چلاتے تھے۔'' (14)

دشمن اور اس کی پہچان

آج پڑھے لکھے طبقے سے بھی اگر کوئی پوچھے کہ ہماری قوم کا حقیقی، اصل اور تاریخی دشمن کون ہے؟ تو مذہبی طبقے کے لوگ ایک دوسرے کے لیے کہیں گے کہ سنی، شیعہ، بریلوی، دیوبندی مسلک کے لوگ قوم کے دشمن ہیں۔ سیاسی ذہن کے لوگ کہیں گے کہ ہماری مخالف پارٹی قوم کی دشمن ہے۔ قوم کے نام پر سیاست کرنے والے نام نہاد قوم پرست کہیں گے کہ پنجابی، پختون، سندھی اور بلوچ ہمارا دشمن ہے وغیرہ۔ ان گروہی ذہنیتوں میں سے اگر کسی کا اثر نہیں ہوگا تو رواداری میں کہہ دے گا کہ ہمارا دشمن تو امریکا ہے۔ پوچھنے پر کوئی معقول دلیل نہیں ہوگی، لیکن سلام ہے ہمارے مرشد و مربی حضرت اقدسؒ کو کہ انھوں نے ہمیں اصل اور تاریخی دشمن کی پہچان دی۔ آپؒ نے بتایا کہ:

www.rahimia.org

''ہر دور میں سرمایہ پرست بالادست طبقہ ہی انسانیت کا دشمن رہا ہے، جو قوم کے وسائل پر قابض بن کر قوم کو بھوک و افلاس اور زوال و پستی کا شکار بنا دیتا ہے۔ آج عالمی سرمایہ داروں کا نمائندہ امریکی نظامِ حکومت ہے، جو سامراجی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کے آلہ کار ادارے، ملٹی نیشنل کمپنیز، ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف' انسانیت کے دشمن ہیں۔''

مارچ 2003ء میں چانڈکا میڈیکل کالج لاڑکانہ میں حضرت اقدسؒ نے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''استحصالی قوتیں تمام وسائل پر قابض ہو کر سماج میں بھوک و افلاس پیدا کرتی ہیں اور سیاست کے ذریعے ظلم کا نظام قائم کرتی ہیں۔ حضور اکرمؐ نے جماعتِ صحابہؓ پیدا کی اور قیصر و کسریٰ کے نظاموں کو توڑا۔ یہ عادلانہ نظام 12 سو سال تک دنیا میں غالب رہا، مگر آج امریکا برطانیہ نے ان کو غلام بنالیا۔ تمام وسائل اور معدنیات پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کا قبضہ ہے۔''[15]

حضرت اقدسؒ کی یہ خصوصیت رہی کہ ہمیں ہر خطاب میں امریکی سامراج کی پاکستان اور دنیا میں سیاسی و معاشی کارستانیوں سے باشعور کرتے اور فرمایا کرتے کہ: ''ہمارا اصل دشمن یہی طبقہ ہے اور دشمن سے مقابلہ کرنا نہایت اعلیٰ خُلق ہے۔''

2006ء کے دورۂ سندھ میں اکثر مقامات پر اپنے خطاب میں سامراجی کارستانیوں کو ہی موضوعِ سخن بنایا۔

اَخلاقیات کا تصور

آج ہمارے معاشرے میں مذہبی طبقات اور خودرَو سماجی و اصلاحی سکالرز کی طرف سے اَخلاقیات کا تصور سماجی حالات کے اثرات سے کاٹ کر انفرادی اور ذاتی زندگی کے حوالے سے دیا جاتا ہے۔ ہمارے مربی حضرت اقدسؒ نے اس حوالے سے ہماری ذہنی اصلاح فرمائی کہ: ''اَخلاقیات کی درستگی کے لیے عادلانہ اجتماعی معاشی نظام اور صالح سماج کا قیام لازمی و ضروری ہوتا ہے۔'' اس کی دلیل میں قرآنی آیات سے استدلال فرماتے اور اکثر یہ حدیث شریف بھی تلاوت فرماتے:

''كاد الفقر أن يكون كفرا''[16] (بھوک کی وجہ سے آدمی کفر تک پہنچ سکتا ہے)۔

حجۃ الاسلام حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار نقل فرماتے اور حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کا یہ قول بھی اکثر نقل فرماتے کہ: ''بُرے معاشی حالات کی وجہ سے انسان کی روح اور جسم دونوں تباہ ہو جاتے ہیں۔''

یوں حضرتؒ نے آج کے روگی مفکرین کے فاسد خیالات سے ہم نوجوانوں کے اذہان صاف فرمائے۔

تحریکِ آزادی کا حقیقی تصور و شعور

ملک کے تمام تعلیمی اداروں میں مطالعۂ پاکستان کے ضمن میں جو نصاب پڑھایا جاتا ہے، اس کے مطابق 1857ء کے بعد ہندو کے مظالم کی وجہ سے سرسیّد نے دوقومی نظریہ دیا اور یہ دوقومی نظریہ تحریکِ پاکستان کی بنیاد ٹھہرا۔ ہماری آزادی کس نے سلب کی؟ ہماری حکومت کس نے غصب کی؟ اس حوالے سے ملکی نصاب پر مہرِ خاموشی ثبت ہے۔ حضرت اقدسؒ نے اس حوالے سے شعور دیا کہ:

www.rahimia.org

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ حکومت برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے مکاری وفریب کے ذریعے ختم کیا، جس کے خلاف ولی اللّٰہی علما نے ہی آزادی وحریت کی تحریک چلائی ہے۔ 1803ء میں حضرت الامام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے فتویٰ دارالحرب کے ذریعے برطانوی ایسٹ کمپنی کے خلاف جنگِ آزادی کی تحریک کا اعلان فرمایا۔ 1831ء کی جنگِ بالاکوٹ ہو یا 1857ء کا معرکۂ آزادی، ان میں ہمارے علما اور مجاہدین نے مجاہدانہ انداز سے دشمن کے خلاف جنگیں لڑیں اور ہزاروں علمائے ربانیینؒ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ انھیں علمائے ربانیینؒ کے سچے جانشین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، حضرت امام عبیداللہ سندھیؒ وغیرہ نے وطن کی آزادی کے لیے 1915ء میں تحریکِ ریشمی رومال (تحریکِ شیخ الہندؒ) چلا کر انگریز کے حواس خطا کردیے اور گرفتار و جلا وطن ہوئے۔ جمعیت علمائے ہند کے علمائے کرام نے قومی جدوجہد کے ذریعے فرنگی سامراج کو ہندوستان سے چلتا کردیا۔''

نیز اس حوالے سے حضرت اقدسؒ تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان کا فرق بھی واضح فرماتے۔ حضرت اقدسؒ کا یہ فرمان تو ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا کہ: ''ہم آپ کو اپنے سے نہیں جوڑتے، بلکہ اپنے ان اکابرین سے جوڑتے ہیں، جنھوں نے سچائی کا راستہ اختیار کیا۔ قربانیاں دیں اور کامیاب ہوئے۔''

نوجوان میں احساسِ ذمہ داری کا تقاضا

حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ اپنے دوروں کے دوران اپنے خطابات میں آنے والے نوجوانوں کو اپنے اندر قومی و انسانی حوالے سے ذمہ داری کا احساس دلاتے اور فرماتے کہ:

''دنیا کی اقوام نے نوجوانوں کی بدولت انقلابات برپا کیے اور آج وہ ترقی کر رہی ہیں۔''

آپؒ نوجوان کے اندر اعلیٰ فکر ونظریہ پیدا کرنے اور اس پر تربیت حاصل کرنے پر خصوصی توجہ دلاتے۔ عبادات کا شعور پیدا کرتے اور اس کی روح سمجھاتے۔

یہ ایک اہم بات ہے کہ حضرتؒ صرف نظریہ اور شعور کی بات نہ کرتے تھے، لیکن اس کے ساتھ باطنی تربیت وتزکیۂ نفس کے لیے تعلق مع اللہ کی ضرورت پر بھی توجہ دلاتے۔ خانقاہِ رائے پور کی شروع سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ ہمارے اکابر سفر وحضر میں باقاعدگی سے ذکرُ اللہ کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے حضرتؒ بھی معمول کے مطابق ذکر کا اہتمام فرماتے اور موقع پر موجود تمام ساتھی بھی حضرت کے ساتھ ذکر میں شرکت فرماتے۔ ذکر کے بعد وقت کی مناسبت سے ذکر کی اہمیت وفضیلت پر آپؒ ملفوظات بھی فرماتے۔ اس طرح احباب کی تعلیم وتربیت کا بندوبست فرمایا۔

نوجوانوں کے لیے پیغامِ انقلاب

حضرت اقدسؒ سندھ کے نوجوانوں کو ان کی ذمہ داری یاد دلاتے رہتے۔ نومبر 1992ء میں حیدرآباد میں جام شورو کی تین بڑی یونیورسٹیز کے طلبا کے ایک سیمینار سے خطاب میں فرمایا کہ:

''آپ نوجوان حضرت سندھیؒ کی اُمید ہیں۔ حضرت سندھیؒ چاہتے تھے کہ نوجوان میری بات سمجھیں اور آگے چل کر انقلاب کی قوت بنیں۔'' حضرتؒ نے فرمایا کہ: ''سماجی انقلاب ایک بہت بڑی تبدیلی کا نام ہے، جس کے

لیے بڑی (اجتماعی) محنت درکار ہے۔''[17]

اکتوبر 2000ء میں، شکارپور میں نوجوانوں کے ایک سیمینار میں ہم نوجوانوں کو حضرت اقدسؒ نے پیغامِ فکر وعمل دیتے ہوئے فرمایا کہ: ''آج ہماری جماعت آپ کو شعور کی دعوت دیتی ہے، تاکہ آپ نوجوان صحیح نظریے اور شعور کے اسلحے سے لیس ہو کر دشمن کے مقاصد کو ناکام کریں۔''[18]

مارچ 2004ء کو لاڑکانہ کے عبداللطیف نظامانی ہال میں ''امام شاہ ولی اللہؒ سیمینار'' میں حضرت اقدسؒ نے سندھ کے نوجوانوں کو ایسے پکارا کہ مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس نے ہماری روحوں میں سوزِ انقلاب کو سِوا کر دیا۔ حضرت نے فرمایا:

''اس فیل شدہ مذہبی طبقے سے ہم نوجوان کو نہیں جوڑ سکتے۔ اس لیے ہم ایسے علما کو متعارف کروائیں گے، جنھوں نے انسانیت کے لیے کردار ادا کیا۔ آزادی کے لیے قربانیاں دیتے ہوئے جیلوں میں گئے اور پھانسیوں پر چڑھے۔ آج امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو سمجھنے کی ضرورت ہے، جنھوں نے عمرانی، سیاسی حوالے سے سارے حل پیش کیے ہیں۔ ان کو بنیاد بنا کر پوری دنیا کی آزاد قوموں کا مطالعہ کریں۔ دنیا کے آزاد نوجوانوں کا نظریہ دیکھیے۔ ویت نام، کوریا، ایران اور چین کے انقلاب کو پڑھیں۔ رجعت پسندی میں کیوں پڑتے ہو، مایوسی کیوں پیدا کرتے ہو۔'' حضرتؒ نے آخر میں فرمایا کہ: ''آپ نوجوانوں نے دنیا کے نوجوانوں کی طرح عزت اور وقار سے جینا ہے تو آج کے دور میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر کو سمجھنا ہوگا اور اس فکر کے ذریعے پاکستان میں انقلاب لا کر اس فرسودہ سماجی ڈھانچے کو تبدیل کرنا ہوگا۔''

غرض کہ حضرت اقدسؒ نے ہم لوگوں کو انفرادیت پسندی سے نکال اجتماعیت کی راہ دکھائی کہ قومیں اجتماعی حوالے سے جدوجہد کرکے آزادی حاصل کرسکتی ہیں۔ اسی طرح انقلاب کے ذریعے اجتماعی نظامِ حیات قائم کرکے قومی و بین الاقوامی سطح پر پُروقار زندگی بسر کرسکتی ہیں۔

آخری سفرِ سندھ کے یادگار ملفوظات

فروری 2011ء میں حضرت اقدس رائے پوریؒ کا آخری سفرِ سندھ ہوا۔ کیوں کہ 2012ء میں حضرتؒ کا طے شدہ دورہ ضعف اور کمزوری کی وجہ سے نہ ہو سکا۔ اس دورے میں حضرت اقدسؒ کے ساتھ ہم نوجوانوں کی استفادہ نشستیں کافی رہیں۔ ان نشستوں میں حضرت اقدسؒ کے حالاتِ زندگی کے بارے میں نوجوانوں نے حضرتؒ سے کافی سیکھا۔ ان نشستوں میں حضرت اقدسؒ نے جہاں ہمیں اپنی زندگی کے اہم واقعات و تجربات اور نشیب و فراز سے آگاہی دی، وہیں ہم نوجوانوں کی تربیت حاصل کرنے، اپنے اندر اَخلاق پیدا کرنے، حُبِّ جاہ اور خواہشات سے بچنے، تنظیمی نظم و ضبط اختیار کرنے اور تنظیمی اداروں پر اعتماد کرنے کے حوالے سے رہنمائی فرمائی۔

حضرتؒ نے نوجوانوں میں دینی فکر و نظریے پر انقلابی تحریک پیدا کردی۔ آج ملک بھر میں سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں یونیورسٹیز و مدارسِ دینیہ کے طلبا اس انقلابی فکر و نظریے سے وابستگی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ حضرتؒ کی پُراثر تربیت کا نتیجہ ہے۔ حضرتؒ ایسے مؤثر انداز سے خطاب فرماتے کہ ہر لفظ ہماری روح کے اندر سرایت کر جاتا۔ ہم نے اپنی زندگی میں کبھی حضرتؒ کو ناراضگی

اور غصے کی کیفیت میں نہیں دیکھا۔ ہمیشہ متحمل، بُردبار اور سنجیدہ و باوقار کیفیت میں ہوتے۔ حضرتؒ نے کبھی جارحانہ اور جذباتی اندازِ تخاطب اختیار نہیں کیا۔ مزاج شریف اکثر پُرلطف ہوتا تھا۔ حضرت اقدسؒ ہم نوجوانوں سے ایسے محبت بھرے انداز سے پیش آتے اور ہم سے اتنی محبت کرتے کہ حقیقی والدین نے بھی نہ کی ہوگی۔ اکثر فرماتے کہ: ''بھائی ہمیں تو اپنے نوجوانوں سے محبت ہے۔''

انقلاب سے آشنائی

آج ہم سندھ اور پاکستان میں انقلاب اور سماجی تبدیلی کی بات کرتے ہیں، لیکن اگر ماضی کے دریچے وا کر کے اپنی زندگی کے اُس دور میں جھانک لیں، جب ہم زندگی کے حقیقی حُسن سے واقف تھے، نہ اس کے اسرار و رموز ہم پر کُھلے تھے۔ انقلاب سے آشنائی تھی، نہ حقیقی آزادی سے عشق تھا۔ اپنے حال میں مست اور مستقبل سے بے پروا تھے۔ حضرت اقدس رائے پوریؒ کی صحبت سے آج ہم اپنی زندگی کو ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کی لگن میں پُر از جدوجہد دیکھتے ہیں تو ہمارا دل و دماغ، عقل و شعور اور جسم و جاں یقیناً مطمئن اور مسرور ہوتا ہے۔ اللہ کے حضور ہم اس نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہمیں حضرت اقدسؒ ایسی کامل شخصیت کے قدموں میں بیٹھنے کا شرف اور توفیق عطا کی کہ جن کے ذریعے ہمارا تعلق ''وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ'' (19) والی اُس جماعت سے جُڑ گیا، جس کے لیے کلامِ الٰہی میں تصدیق آئی ہے کہ ان سے رب السمٰوٰت والارض خوش ہے اور وہ اپنے خالق سے راضی ہیں۔

غرض کہ حضرت اقدسؒ کی اس شبانہ روز جدوجہد و تعلیم کے نتیجے میں ہم اہلِ سندھ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے انقلابی فکر و فلسفے اور تحریک سے عملی طور پر متعارف ہوئے۔ حضرت اقدسؒ کے فکر و نظریے اور ہمارے سندھ میں سالانہ اسفار کے نتیجے میں ہماری زندگیوں میں ایسا انقلاب آگیا کہ جس کے نتیجے میں وہ نوجوان جو دین سے بے خبر تھے، آج دینی فہم و شعور سے بہرہ ور ہیں۔ جن کا مسجد و عبادت سے تعلق نہیں تھا، آج روحانی و اَخلاقی ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ جن کو انبیائے کرامؑ اور حضرت نبی اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کی سیرتِ مبارکہ کی خبر نہیں تھی، آج ان کی سیرتِ مبارکہ کا مطالعہ اجتماعی زندگی کی کامیابی کے لیے لازمی جُز مانتے ہیں۔ جن کو علمائے ربانیین اور اولیائے کرام کا تعارف نہیں تھا، آج وہ محبت اور سچی عقیدت سے ان کے تذکرے سے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ جنھیں انقلاب اور آزادی کے تصور و شعور سے دور کا واسطہ نہیں تھا، آج وہ انقلاب اور آزادی کے متوالے اور داعی ہیں۔ آج سندھ کے ہزاروں نوجوان ولی اللّٰہی فکر کو حرزِ جاں بنائے ہوئے، شب و روز انقلابی جدوجہد کے لیے مصروفِ کار ہیں۔ وہ نوجوان جن کا اوڑھنا بچھونا اپنی ذاتی زندگی تک محدود تھا، آج نہ صرف اپنی قوم بلکہ پوری مظلوم انسانیت کے لیے تڑپ اور جذبہ رکھتے ہیں۔ نہ صرف نوجوان حضرات، بلکہ حضرت اقدسؒ کے دورے میں اکثر شہروں میں خواتین کے لیے بھی درس کا اہتمام ہوتا تھا، جس میں ہماری سینکڑوں بہنوں نے حضرت اقدسؒ کا درسِ ارشاد سنا، حضرت اقدسؒ کے افکار و نظریات سے استفادہ کیا اور آج بھی اس فکر و نظریے سے وابستہ اور اس کے پھیلاؤ کے لیے کوشاں ہیں۔

جس طرح حضرت اقدسؒ کو اس فکر و تحریک اور مشن کی امانت سونپی گئی تھی، آپؒ نے مِن وعَن اس پر اپنے اکابرین کی سرپرستی و رہنمائی میں نوجوانی سے لے کر عمرِ عزیز کے آخری دم تک عمل کیا۔ حضرت اقدسؒ نے تشدد اور مروّجہ سیاسی کلچر سے ہٹ کر عدمِ تشدد، مزاحمتی شعور اور تعلیمی انداز سے کام کرنے کی حکمت عملی سمجھائی۔ شروع میں پورے پاکستان سمیت صوبہ سندھ میں

بھی چند احباب ہی حضرتؒ کے ساتھ تھے، جن میں نمایاں محترم جناب ڈاکٹر سیّد لیاقت علی شاہ معصومی (سکھر)، جو کہ 1969ء کے شروع سے ہی حضرت اقدسؒ سے وابستہ ہوگئے۔ جب کہ دیگر احباب میں محترم جناب حاجی محمد بلال بلوچ (قاضی احمد، ضلع نوابشاہ)، محترم مولانا عبداللہ عابد سندھی (شکارپور) اور حضرت مولانا محمد اشرف اثر (حیدرآباد) نمایاں ہیں۔ یہ چاروں حضرات 1970ء کی دہائی سے حضرت اقدسؒ کے ساتھ سخت ابتلا اور تکالیف کے باوجود کامل استقامت کے ساتھ وابستہ رہے۔ ان حضرات کی براہِ راست حضرت اقدسؒ نے فکری ونظریاتی آبیاری کی اور شعوری تربیت و رہنمائی فرمائی۔ یہ چاروں حضرات، حضرت اقدسؒ کے دورۂ سندھ میں ساتھ رہتے اور حضرتؒ کے ساتھ سندھ کے نوجوانوں میں ولی اللّٰہی فکر کی آبیاری کرتے۔ جب کہ باقی دنوں میں بھی ان حضرات نے جانفشانی، لگن اور بھرپور محنت و حکمتِ عملی سے حضرتؒ کی رہنمائی کے مطابق سندھ کے اکثر شہروں میں تنظیمی نظم قائم کیا۔ 2012ء کے شروع میں حضرت اقدسؒ نے ان چاروں حضرات پر اپنے مکمل اعتماد و بھروسے کا اظہار کرتے ہوئے کمالِ شفقت و محبت سے ان کو خانقاہِ رائے پور کی خلافت و اجازتِ بیعت کے اعزاز سے سرفراز فرمایا۔ ان کے ساتھ بلوچستان سے محترم مولانا مفتی سیّد انور شاہ بھی خلافت کے اعزاز سے سرفراز ہوئے۔ جب کہ سندھ کے نمایاں نوجوانوں میں محترم جناب پروفیسر امجد علی آرائیں (محراب پور ضلع نوشہرو فیروز) 1987ء اور محترم جناب انجینئر آفتاب احمد عباسی (لاڑکانہ) 1989ء کے اواخر سے حضرت اقدسؒ اور سندھ کے ان سینئر حضرات کے زیرِ تربیت رہے، اور آج سندھ و بلوچستان کے نوجوانوں میں اس فکر ونظریہ کو پھیلانے اور ان کی تربیت میں مصروفِ عمل ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرتؒ کے ساتھ سندھ کے دورے میں محترم جناب سیّد مطلوب علی زیدی مدظلہ 2001-02ء تک (بقائمیِ صحت تک) ہمیشہ شریکِ سفر رہے۔ بعد میں 2011ء تک ہمارے موجودہ رہبر و رہنما حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ اور حضرت مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی مدظلہٗ شریکِ سفر رہ کر نوجوانانِ سندھ میں اکابرین کے فکر ونظریے پر رہنمائی فرماتے۔ ہماری تنظیمی زندگی میں ایک اہم سنگ میل اُس وقت طے ہوا، جب حضرت اقدسؒ کی مکمل توجہ، جاں فشانی اور رہنمائی میں نوجوانوں کی تنظیمی تربیت کے حوالے سے 2001ء میں لاہور میں ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) کی بنیاد رکھی گئی۔ اس ادارے میں حضرت اقدسؒ نے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے اپنے دستِ مبارک سے تیار کردہ مرکزی ٹیم مقرر فرمائی، جو کہ اپنی بھرپور توجہ اور لگن سے مقررہ ذمہ داری ادا کر رہی ہے۔

آج ہمارے مربی و مرشد، مفکرِ انقلاب، داعیِ تحریک نشاۃ ثانیہ اسلام، وارثِ فکرِ اسلاف، مرشدنا و مولانا حضرت اقدس شاہ سعید احمد رائے پوری نوراللہ مرقدہ اگرچہ جسمانی طور پر ہم میں موجود نہیں ہیں، 26ر ستمبر 2012ء ستمگر بن کر ہماری زندگی سے ہمارے روحانی باپ کو ہم سے الگ کر گیا، لیکن پھر بھی فرشِ زمین سے عرشِ بریں تک اعلیٰ نظریہ دینے والے ہمارے پیارے اور محبوب حضرتؒ، آدمؑ تا ایں دَم تاریخی شعور بخشنے والے ہمارے مُربی حضرت، عشقِ نبیؐ کی حقیقت سے آشنا کرنے والے ہمارے روشن دماغ حضرت، آدمیت و انسانیت کا سوز و درد جگانے والے رقیق القلب حضرت، ہماری ناقص اور پُر خار زندگی میں بہارِ زیست کا سامان بننے والے ہمارے رہبر و رہنما حضرتؒ، ہمیں عشقِ آزادی و انقلاب سے روشناس کرنے والے ہمارے مرشد حضرتؒ، ہماری ارواح و قلوب کی خوابیدہ تاروں کو جگانے والے ہمارے ولیٔ کامل حضرتؒ، ہمارے فکر و شعور میں، دل و دماغ میں، تحریک و تنظیم میں، تحریر و تقریر

میں، خواب و خیال میں اور ہمارے حال و مستقبل میں زندہ و تابندہ رہیں گے۔ **انشاء اللّٰہ و بتوفیقہٖ تعالیٰ.**

حضرت اقدسؒ نے اپنے بعد ہماری تعلیم و تربیت اور ہدایت و رہنمائی کے لیے ہمیں تشنہ نہیں چھوڑا، بلکہ ایک ماہر ہیرا شناس جوہری کی طرح ایک ایسا گوہرِ نایاب، آپؒ کے جانشین اور ہمارے موجودہ رہبر و مرشد حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہٗ العالی تراش کر ہمیں دے گئے کہ جس پر ہمارے دل و دماغ اور جسم و جاں خوش و خرم اور نازاں و فرحاں ہیں۔ جن کے قلبِ سلیم و عزمِ صمیم سے پھوٹنے والی رہنمائی کی روشنی میں منزلِ مراد واضح اور قریب نظر آ رہی ہے۔ نہ صرف یہ، بلکہ سرسبز اور معطر و ہمہ رنگ پھولوں کے گلدستے کی مانند ایک ایسی پُر بہار ٹیم (ہمارے موجودہ مرشد حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد مدظلہ کے علاوہ، حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر سعید الرحمٰن مدظلہ، حضرت مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی مدظلہ، حضرت مولانا محمد مختار حسن مدظلہ، حضرت مولانا مفتی عبدالقدیر مدظلہ، حضرت ڈاکٹر سیّد لیاقت علی شاہ معصومی مدظلہ اور نوجوان دانشور اور ولی اللّٰہی فکر کے ماہرین ڈاکٹر عبدالرحمن راؤ اور آفتاب احمد عباسی، مولانا محمد ناصر عبدالعزیز صاحبان) اور باشعور جماعت دے گئے ہیں کہ آنے والی نسلِ انسانیت جس کی رہنمائی و تقلید کو باعثِ صد افتخار مانے گی۔

ہم آنے والے دنوں میں دینِ اسلام کے عادلانہ نظام کے غلبے کے لیے کوشاں ہیں۔ انسانیت پر موجود طاغوتی نظام کو ختم کرکے انبیائے کرامؑ، نبی اکرمؐ، صحابہ کرامؓ، اولیائے عظامؒ، ولی اللّٰہی اکابرینؒ اور رہبر و مرشدِ انقلاب حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کے افکار پر اعلیٰ انسانی نظام بذریعہ انقلاب قائم کریں گے۔ اور آج کی مظلوم انسانیت عدل و انصاف، ترقی و خوش حالی اور امن و رواداری کے اس اعلیٰ فکر کو پھر سے اپنانے میں ہی اپنی نجات سمجھے گی۔ **انشاء اللّٰہ العزیز الحکیم۔**

حوالہ جات

1۔ خطبات و مقالات، از امام عبیداللہ سندھیؒ، ص: 311، طبع: دارالتحقیق والاشاعت لاہور۔

2۔ سیّد احمد شہیدؒ، از مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی، حصہ اوّل، ص: 461، 478، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، 2011ء۔

3۔ نقشِ حیات، از مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، ج: 2، ص: 616، طبع: دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی

4۔ خطبات و مقالات، ص: 431، 478۔

5۔ سماجی انصاف اور اجتماعیت، از مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ، ص، 15۔ رحیمیہ مطبوعات لاہور۔

6۔ عزم سریز نمبر 131، ص: 24۔ 7۔ ایضاً، 130، ص: 18۔ 8۔ ایضاً، 208، ص: 26۔

9۔ القرآن: 22:58۔ 10۔ القرآن 28:48۔ 11۔ عزم سیریز نمبر 214، ص: 29۔

12۔ عزم سیریز نمبر 192۔ 13۔ عزم سیریز نمبر 130، ص: 21۔ 14۔ عزم سیریز نمبر 228۔

15۔ عزم سیریز نمبر 207۔ 16۔ شعب الإيمان للبيهقيؒ، حدیث نمبر 6188۔

17۔ عزم سیریز نمبر 120۔ 18۔ عزم سیریز نمبر 186۔ 19۔ القرآن 100:9

☆

www.rahimia.org

جمہور کے تسلیم کردہ مسلمہ قانون کی اہمیت

''کسی ریاستی نظام کی تشکیل کے لیے معاہدۂ عمرانی وجود میں لایا جاتا ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے ایک آئینی اور قانونی نظام کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ کے الفاظ ہیں:

''لا بُدّ لهم من سنّةٍ عادلةٍ مسلّمةٍ عند جماهيرهم يفزع إليها فی فصل الخصومات.'' (16)

(ملک میں بسنے والے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا عدل و انصاف پر مبنی جمہور کا مسلمہ قانون اور نظام قائم کریں کہ جسے لوگوں کے جھگڑے نمٹانے کے لیے پیش نظر رکھا جائے۔)

یعنی اُس ریاست میں بسنے والے جمہور لوگوں کے اتفاق سے بننے والی ''سنتِ عادلہ'' یعنی عدل و انصاف پر مبنی طریقۂ کار اور قانون وجود میں آنا چاہیے۔ کوئی طبقہ، کوئی گروہ، کوئی جماعت اپنی گروہی طاقت کے بل بوتے پر اپنا خود ساختہ کوئی آئین اس پر مسلط نہیں کرسکتی۔ جمہور کی رائے سے قانون وجود میں آئے۔ کوئی بزنس کمیونٹی صرف اپنے مفاد کے لیے آئین اور قانون بنائے۔ کوئی لینڈ لارڈ محض اپنے مفادات کا آئین اور قانون مسلط کر کے کہے کہ یہ قانون کی حکمرانی (Rule of Law) ہے، یہ درست نہیں۔ لہٰذا پہلے قانون معلوم ہونا چاہیے، جس کی حکمرانی قائم کرنی ہے۔ قانون اگر جاگیرداری کے مفاد کا ہے اور سرمایہ دار کے مفاد کا ہے تو پہلے تو قانون کو چیلنج کیا جائے گا کہ یہ قانون کیا جمہور کے مفاد میں ہے؟ شاہ صاحبؒ نے دوٹوک ضابطہ بتا دیا، واضح کر دیا کہ کسی بھی قومی جمہوری ریاست کے لیے ضروری ہے کہ جمہور کے مفادات یا جمہور کی تسلیم شدہ (**مسلّمة عند جماهيرهم**) اساس پر قانون بنے گا۔''

(امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اِرتفاقات، ص:23)

QUARTERLY

Shauor o Aaghi

July-september,2019 Vol.11 Issue,3 Regd.370-S

www.rahimia.org

رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

00-92-42-36307714, 36369089 www.rahimia.org

info@rahimia.org /rahimiainstitute